بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادِ بیدل حیدری

انٹرنیشنل

ادب و ثقافت

8

مدیران

شکیل سروش ، شیخ اعجاز

رابطہ کیلئے

1601 N. Farwell Ave, # 110, Milwaukee WI 53202, U S A.
Phone:4143505594
Shakeelsarosh@gmail.com

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay, FL.32909, U.S.A.
Phone:321-674-9837
Sheikh.ijaz.ahmed@gmail.com

www.adab-o-saqafat.com

مشاورت

احمد شہباز خاور (پاکستان) — محمود عامر (پاکستان)

جمشید مسرور (ناروے) — سجاد حیدر (برمنگھم)

لیاقت علی عہد (مانچسٹر) — شہزاد اسلم (لندن)

بابر شاہین (کینیڈا) — رامش منہاس (پاکستان)

ڈاکٹر نگہت نسیم (آسٹریلیا) — طاہر عدیم (جرمنی)

زیر اہتمام

فسٹ سٹیپ پبلی کیشنز، امریکہ

First Step Publications, U.S.A.

ناشر

محمد عابد

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد، پاکستان

Phone:+92 412615359- 2643841, Cell:0333-9933221

E-mail:misaalpb@gmail.com

اپنی بات

ادب وثقافت کا تازہ شمارہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

پچھلے چند سالوں سے دنیا قدرتی آفات کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہے۔جنگوں' سیلابوں' سمندری طوفانوں اور زلزلوں نے انسانی بے بسی اور بے چارگی کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ابھی ایشیا میں سونامی کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے کہ امریکی ریاست Louisiana کا شہر New Orlean جو کبھی زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور تھا۔قطرینا نامی طوفان کی زد میں آ کر برباد ہو گیا۔بے شمار لوگ موت کے منہ میں چلے گئے اور ہزاروں بے گھر ہو گئے۔

ان آبی طوفانوں کا زور ٹوٹا تو پاکستان کی جنت نظیر وادیٔ کشمیر اور اس کے شمالی علاقہ جات کو زلزلوں نے آ لیا۔دیکھتے دیکھتے گھر اور بازار زمین بوس ہو گئے اور لاکھوں لوگ ملبہ تلے دفن ہو گئے۔انسانی موت ایک طرف' زندہ بچ جانے والے زخمیوں اور معذوروں کی تعداد اَن گنت ہے۔

دنیا بھر سے آنے والی کھربوں ڈالر کی امداد جو بے گھروں' زخمیوں اور معذوروں کے لیے تھی' سامان' خیمے' بستر' کمبل' ادویات پر ہمارے سیاست دان ٹوٹ پڑے۔کمینگی اور منافقت کی مثال ہمارے سیاست دان اس امداد سے اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہو گئے۔

ہیلی کاپٹروں سے لوگوں کی مدد کرنے اور ملبے تلے دبے لوگوں کو نکالنے کی بجائے۔ان ہیلی کاپٹروں پر ان علاقوں کے دَورے کر کے تصاویر بنوانے میں مصروف ہیں اور مستحق لوگ مدد سے محروم ہیں۔جب کہ بعض بڑی چھوٹی تنظیمیں ذاتی طور پر لوگوں کی مدد کر رہی ہیں۔پاکستانی عوام نے بھی دل کھول کر عطیات دیئے اور اس مشکل گھڑی میں اپنے ہم وطنوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ان سانحوں اور ان کے نتیجے میں ضائع ہونے والی انسانی جانوں پر ہمیں بھی دلی افسوس ہے۔خدا ہمیں ایسی آفات سے محفوظ رکھے۔آمین

-ادارہ-

فہرست

نعت

بیدل حیدری	5
مظہر بخاری	6
ظفرالحق چشتی	6

نظمیں

خواب	بیدل حیدری	7
ضروری تو نہیں/جب گل ہوا چراغ	اسد رضوی	8
موت دل سے لپٹ گئی اُس شب	ابرار احمد	9
موجود سے پرے	ابرار احمد	10
مری حیات ہے تو	مظہر بخاری	10

مضامین/افسانے

مرنے سے انکاری قاضی شاہد کی کہانی	ڈاکٹر انوار احمد	11
ترکش کی کہانی (تیر کھائے ہوئے دل کی زبانی)	عدیم ہاشمی	15
ہیں خواب میں ہنوز۔۔۔	غلام حسین ساجد	25
فیض کی شاعری میں سماجی شعور کا ارتقاء	ڈاکٹر محمد امین	34
مجید امجد کی شعری ہئیتیں	سیّد عامر سہیل	39
آخری آئس کیوب	محمد حامد سراج	59

غزلیات

71

بیدل حیدری	شہزاد احمد	غلام حسین ساجد	نجیب احمد	سعداللہ شاہ	آغا نثار
جمشید مسرور	محمود عامر	شوکت فہمی	عرفان صادق	محمد خالد/ابرار احمد	ریحانہ قمر
اسد رضوی	ارشاد جالندھری	محمد رفیق سیٹھی	مظہر بخاری	رامش منہاس	فقیر شکورالرحمٰن
شوکت کاٹھیا	رضا عباس رضا	شبیر شاذل	محمد رمضان	ش۔ا۔اعجاز	شکیل سروش

نعت

بیدل حیدری

مری بیاض کی ہر نعت ، ہر سلام ترا
قلم نے جو بھی لکھا ، آج تک تمام ترا

ترے نثار ! اُجالوں کی سلطنت والے
سحر سفیر تری ، روشنی پیام ترا

تو جب بھی چاہے دو عالم کی گردشیں رُک جائیں
زمیں کنیز تری ، آسماں غلام ترا

مہ و نجوم کا ہر خطّہ ، سیر گاہ تری
ہر ایک بُرجِ فلک ، جادۂ خرام ترا

اِدھر حرارتِ بستر اُسی طرح موجود
اُدھر فلک پہ رہے مدتوں قیام ترا

تری ثنا میں تو بیدلؔ سے قمریاں اچھی
پرندے ہوتے ہوئے ، ذکرِ صبح و شام ترا

نعت

مظہر بخاری

جونہی نبی ﷺ کے نور کی تشکیل ہو گئی
اِک عکسِ ناتمام کی تکمیل ہو گئی

فطرت کے ذہن میں تھے سراپے جدا جدا
یکجا ہوئے تو نور کی ترسیل ہو گئی

پہلے تو شر محاذ پہ پسپا نہیں ہوا
پھر یوں ہوا کہ فتح ابابیل ہو گئی

فاراں کی وادیوں سے جب اُترے زمین پر
آب و ہوائے شہر ہی تبدیل ہو گئی

نورِ نبی ﷺ کے فیض سے تاریک رات بھی
مظہرؔ رُخِ حیات میں تحلیل ہو گئی

نعت

ظفرالحق چشتی

لاکھ بے مائیگی ہے بے سروسامانی ہے
نعتِ سرکار ﷺ لکھوں دل میں یہی ٹھانی ہے

دعویٰ عشقِ محمد ﷺ تو نہیں ہے لیکن
قلب بیتاب ہے اشکوں کی فراوانی ہے

وہ مجھے اپنا بنا لیں تو کرم ہے اُن ﷺ کا
میرا انداز بلالی ہے نہ سلمانی ہے

بھیک میں مانگتا ہوں آلِ نبی ﷺ کے دَر سے
یہ گدائی نہیں کونین کی سلطانی ہے

میں تہی دست بھی شاہوں کی طرح رہتا ہوں
اہلِ ثروت کو اسی بات کی حیرانی ہے

یہ بھی تو معجزۂ حُبِّ نبی ﷺ ہے گویا
ہجر کی رات میں بھی وصل کی تابانی ہے

ہم کو مل جائے خدا اُن ﷺ کے وسیلے کے بغیر
زاہد و جھوٹ ہے یہ وہم ہے نادانی ہے

کچھ نہیں دل میں ظفرؔ نامِ محمد ﷺ کے سوا
قبر ہو حشر ہو آسانی ہی آسانی ہے

خواب

بیدل حیدری

سالِ نو ، سال امن کہلائے
کاش یہ سال ہم کو راس آئے

آنگنوں کے خزاں درختوں پر
جھوم کر خوشبوؤں کا بُور آئے

امن کو دیرپا عروج ملے
ایٹمی دَور کو زوال آئے

روشنی کی کوئی کِرن پھوٹے
ظلمتوں میں دراڑ پڑ جائے

کسی انساں کے سامنے جا کر
کوئی انساں نہ ہاتھ پھیلائے

کوئی بھوکا نہ سوئے دنیا میں
رات بھر سب کو سُکھ کی نیند آئے

آدمیؑ آدمی کا ہو غم خوار
خانہ جنگی کو موت آ جائے

جس سے خوشحالیوں کا دَر وا ہو
ایسا بھرپور انقلاب آئے

زیست ، آزادِ غم رہے بیدلؔ
کوئی خطرہ نہ سر پہ منڈلائے

نظمیں

اسد رضوی

ضروری تو نہیں

چاہا جسے
مل جائے
ضروری
تو نہیں ہے
ہر پھول ہی
کھل جائے
ضروری
تو نہیں ہے
اِک ادھ ہی
ہوتا ہے
جو بس جاتا ہے
دل میں
ہر شخص پہ
دل جائے
ضروری
تو نہیں ہے

جب گل ہوا چراغ

زندہ ضمیر لوگ
تھے جتنے بھی
کٹ گئے
لیکن چلو
یہ شب کے
اندھیرے تو
چھٹ گئے
جب گل ہوا چراغ
تو کچھ
مصلحت پسند
چپکے سے
اُٹھ کے اپنے
گھروں کو
پلٹ گئے

نظمیں

ابرار احمد

موت دل سے لپٹ گئی اُس شب

ایک خوابِ ہزیمتِ دنیا
ایک آہٹ دوامِ خواہش کی
ایک جوڑی قدیم ہاتھوں کی
اور آنکھوں کے بند فرغل میں
ایک خواہش، ہمیشہ رہنے کی
ایک بستر، پُرانی یادوں کا
اور سویا ہوا دلِ وحشی
آہنی اُنگلیوں کے پنجے میں
اِک گھنی تیرگی کے رستے میں
ذائقہ، بھولی بسری بارش کا
ایک سایہ، جھکا ہوا دِل پر
دیر تک آسماں سے گرتی ہوئی
ایک مدھم صدا، دریچوں میں
ایک پُرشور سیل کی آواز
سانس کی سلوٹیں، ڈبوتی ہوئی!
کون تھا، اُس سمے کے آنگن میں
جاگتی رات کو تھپکتا ہوا
کون تھا، رات دن کے پھیرے میں
گئی دنیاؤں سے اُبھرتا ہوا
رور ہا تھا دیارِ غربت میں
اور معدوم کے علاقے میں
اپنی آنکھوں میں ڈال کر مٹی
خواب تکتا ہوا میں بچپن کے
ایک ہنستے ہوئے، گزشتہ میں!

موجود سے پرے

کتنی باتیں ہیں لبھانے والی
ناشتہ، دودھ
نئے دِن کا پرانا اخبار
دوشِ امروز پہ ماضی کا غبار
خوابِ آسودگی
آوارہ خرامی دل کی
میلے کپڑوں میں گئی رات کا گدلا پانی
اور بانہوں میں مچلتی ہوئی
بیدار ہنسی
اُجلے دالان میں
قدموں سے لپٹتی ہوئی خوش پوش ہوا
اور آنکھوں پہ کوئی ہونٹ
نئے لمس کی آسائش میں
یاد کے رُخ پہ
اُڑتے ہوئے موجود کے بادل کی ردا
اور متروک علاقوں میں کہیں
ایک آواز
فراموش زمانوں میں اُترتی ہوئی
دم توڑتی، بیکار صدا!

مری حیات ہے تُو

مظہر بخاری

دیارِ خواب سے باہر بھی ایک دنیا ہے
زمین گردشِ افلاک کے سبب ہے زمین
سیارے پرتوِ خورشید کا نیا اسلوب
جہاں جہاں کہیں راہِ نجات جاگتی ہے
وہاں وہاں مرے سچ کا چراغ روشن ہے
اُفق اُفق نئی دنیا نیا مزاج لیے
پُکارتی ہے ستارہ شناس کون ہے تو۔۔۔!
تو بانکپن ہے سپیدِ سحر کے ہر پل کا
ہر ایک پل ہے حوالہ نئے زمانوں کا
مرے بدن میں اب انگڑائیاں اُبھرتی ہیں
بس ایک یاد دریچوں سے جھانکتی ہے مجھے
مَیں سیڑھیوں پہ کھڑا دیکھتا ہوں چاروں طرف
تو بالکونی سے خوشبو اُترنے لگتی ہے
مشامِ جاں میں نیا رنگ بھرنے لگتی ہے
مَیں بھول جاتا ہوں افلاک اور ستاروں کو
زمین کیا ہے، سیارے سب استعارے ہیں
یہ کائنات ترے حُسن کا ہے عکسِ جمیل

یہ میرا چہرہ، یہ آنکھیں
یہ ہونٹ اور یہ ہاتھ
ازل سے آج تلک سب تری امانت ہیں
مَیں کچھ نہیں تھا نہ کچھ ہوں
بس ایک تو ہے فقط
تو کائنات بھی اور حُسنِ کائنات بھی تو
مرا کمال بھی تو ہے، مری حیات بھی تو

ہیں خواب میں ہنوز۔۔۔

غلام حسین ساجد

''آٹھ غزل گو'' کے مرتب جاوید شاہین نے جب اپنا پہلا شعری مجموعہ [''زخمِ مسلسل کی ہری شاخ'' اشاعت:1970ء] شائع کیا تھا تو یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہو گی کہ اُس کے اگلے ہی شعری مجموعے ''صبح سے ملاقات'' میں چھبیس نثری نظموں کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد گھٹ کر صرف آٹھ رہ جائے گی۔ تب سے اب تک جاوید شاہین کے چار اور شعری مجموعے ''محراب میں آنکھیں''؛ ''نیکیوں سے خالی شہر''؛ ''جاگتا لمحہ'' اور ''دیر سے نکلنے والا دِن'' شائع ہو چکے ہیں اور غزل اور نظم' ہر دو صنفِ سخن سے یکساں غرض رکھنے کی بنا پر اُس پر کسی ایک صنفِ سخن کے شاعر ہونے کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا اور اُس کے کلام کے مجموعی مطالعے کے بعد یہ کہہ دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ جاوید شاہین اوّل و آخر ایک وہبی شاعر ہے۔

جاوید شاہین کا شعری سفر ناصر کاظمی' احمد مشتاق' ظفر اقبال' سلیم شاہد اور منیر نیازی کی ہمراہی میں آغاز ہوتا ہے اور اُس کا اوّلین شعری مجموعہ ''زخمِ مسلسل کی ہری شاخ'' اِس لحاظ سے توجہ کے لائق تھا کہ یہ ساٹھ کی دہائی میں اُٹھنے والی آوازوں کا نقطۂ عروج تھا اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے باعث پاکستان کے دولخت ہونے اور تاریخ سے بے گانگی کا سفر آغاز ہونے سے پہلے کی آخری دستاویز۔ اس پر مستزاد یہ شعری مجموعہ جدید غزل یا نئی غزل کے داعی شعراً کی آخری نشانی بھی ہے کیونکہ اُس وقت لسانی تشکیلات کے جن اپنے وجود میں سمٹنے لگے تھے اور آنے والی نسل' یعنی ستر کی دہائی کے شعراً کے سامنے شاعری کا ایک نیا' زرخیز' شاداب اور کشادہ علاقہ اپنے خزینے ظاہر کرنے کو بے چین تھا۔ پہلی نسل کے شعراً کے قدموں تلے کی زمین سِرک چکی تھی اور آسمان اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ یعنی یہ وقت تہذیبی اور روحانی اساطیر کے کھوج میں نکلنے کا تھا اور اُردو غزل اِس سفر میں نکلنے پر ابھی آمادہ نہیں تھی۔

اِسی لیے جاوید شاہین نے ظفر اقبال کی طرح چبائی ہوئی نعمتوں کی جگالی کرتے رہنے اور کم خوراک سے زیادہ جھاگ پیدا کرتے رہنے کے بجائے اپنے وجود اور موجود کی شکست وریخت کی پہچان اور تفہیم نثری نظم کے حوالے سے کی۔ کسی نئی صنفِ سخن سے معاملہ کرنا نئی عورت سے معاملہ کرنے کی طرح ہوتا ہے جو آدمی کو مٹا دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور

ازسرِنو زندہ کرنے پر قادر بھی ہوتی ہے۔ جاوید شاہین خوش قسمت تھا۔ اِس لیے اپنے اندر کی توڑ پھوڑ کو تو برسوں کی چپ اور صبر کے ساتھ اپنی رُوح پر جھیل کر، اُس کے اندر کا شاعر نثری نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا کر پہلے سے کہیں طاقتور اور تازہ دم ہو کر ''صبح سے ملاقات'' میں ایک الگ ہی روپ میں سامنے آیا جو اپنے عہد کے دوسرے شعرا سے منفرد اور تیار تھا اور جس کی تاثیر اور طاقت کی بنیاد تاریخی جبر اور ذاتی زیاں سے پیدا ہونے والا لحن پر تھی۔ نثری نظم کو اپنے ہونے کا جواز ''صبح سے ملاقات'' کی اشاعت کے بعد ملا۔

ایک نئے شعری لحن کی دریافت نے کچھ دیر کے لیے جاوید شاہین کو غزل کو ذریعۂ اظہار بنانے سے گریز کرنے پر مجبور کیے رکھا مگر ''محراب میں آنکھیں'' کے ساتھ ہی آہنگ اور لَے کی زنجیریں توڑ کر باہر نکلنے کی آرزو کو قرار مل گیا اور اُس نے اپنی اگلی تینوں کتابوں ''نیکیوں سے خالی شہر''، ''جاگتا لمحہ'' اور ''دیر سے نکلنے والا دن'' میں غزل اور نظم کو ایک جیسی رغبت اور آسائش سے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا جس سے بالآخر یہ بات واضح ہوگئی کہ جاوید شاہین کا نثری نظم کی طرف رجوع کرنا' صنفِ غزل کو ذریعۂ اظہار بنانے میں ناکام رہنے کے باعث نہیں تھا۔ اپنے موجود اور اپنے باطنی انتشار کے بے ساختہ اظہار کی خاطر تھا۔ کیونکہ یہ اَمر آج ایک کلیئے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ ہر صنفِ سخن اپنے وجود میں آنے کا جواز رکھتی ہے مگر اُس کے تمام تر امکانات کو استعمال میں لانا کسی عام شاعر کے بس کی بات نہیں ہوا کرتی۔ جاوید شاہین سے پہلے نثری نظم کے امکانات کو استعمال میں لانے کی عمدہ مثالیں قریب قریب ناپید ہیں۔

ستائیس نظموں اور اٹھارہ غزلوں پر مشتمل یہ کتاب ''دیر سے نکلنے والا دِن'' جاوید شاہین کی کلیاتِ شعر ''عشق تمام'' اشاعت: 1993ء کے بعد' لگ بھگ آٹھ برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب سال 2004ء کے اواخر میں اُس کا نیا ایڈیشن سات نظموں اور اکیس غزلوں کے اضافے کے ساتھ سامنے آیا ہے' جس نے کتاب کی ضخامت میں اضافہ کرنے کے علاوہ اُس کے باطن کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ کسی کتاب کو اِس قدر اضافے کے ساتھ شائع کرنے کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ شاعر اپنی کتاب کی پہلی صورت کو نامکمل محسوس کرتا ہو اور اُس کے نقوش کو مزید پختہ کرنے اور اُس کی طاقت کو اور بڑھانے کا خواہش مند ہو اور ایک ضمنی سبب یہ کہ نئے مجموعے کی اشاعت کا سامان موجود نہ ہونے پر اُس سے پہلے سے موجود کتاب میں اضافہ کر لینا بہتر خیال کیا ہو مگر ''دیر سے نکلنے والا دن'' کی ضخامت کو لگ بھگ دُگنا کرنے سے میرا دھیان' کتاب کے تاثیر اور طاقت میں اضافہ کرنے کی ترجیح کی طرف ہی جاتا ہے اور کتاب کے مطالعے سے بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جاوید شاہین کے پیشِ نظر اِس ترجیح کے سوا کوئی اور صورت تھی ہی نہیں۔

''دیر سے نکلنے والا دِن'' جاوید شاہین کی دوسری کتابوں کی طرح ایک ایسی دستاویز ہے جو اپنے اندر اپنے عصر کے تمام تر عذاب اور انتشار کو سمیٹے ہوئے ہے کیوں کہ جاوید شاہین کی شاعری مشقِ سخن کرتے چلے جانے کا نام نہیں۔ وہ اپنے عہد' اپنے عصر اور اپنے موجود سے مکالمہ کرنے والا شاعر ہے اور اُس کے یہاں شاعری' تاریخی تسلسل میں بہتے وقت کو اپنی گرفت میں لے کر ایک نئی صورت اور معنویت دینے کا ثمر بن کر ظہور کرتی ہے۔ کبھی موجود و میسر اور کبھی کھوئی ہوئی یا مستقبل میں ہاتھ

آنے والی نعمتوں کے باطنی ادراک سے وہ کل کو آج اور آج کو کل میں تبدیل کرنے پر قادر رہتا ہے اور اُس کے یہاں ہر ساعت نیرنگِ نو بن کر بھی اتنی ہی مانوس اور دِلفریب رہتی ہے۔

سراج منیر نے اپنے مضمون ''یہ خواب ہے اور ہی کہیں کا'' میں کہیں لکھا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اور سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کی نسل کا مشترکہ استعارہ ''یاد'' تھا اور اُس کے بعد کی نسل کا مشترکہ استعارہ ''خواب'' ہے۔ مَیں سراج منیر سے متفق ہوتے ہوئے اِس ضمن میں یہ اضافہ کرنے کی جسارت کروں گا کہ آج کے شاعر کا مشترک استعارہ، خواہ وہ کسی بھی نسل کے متعلق ہو ''خواب'' ہی ہے۔ بلکہ یہ ''خواب'' اب استعارہ کی سطح سے بلند ہو کر ایک علامت، ایک اسطورہ میں ڈھل گیا ہے۔ ''دیر سے نکلنے والا دن'' کی سب سے واضح علامت بھی ''خواب'' ہی ہے، جس کے لطف اور جمال کو طویل تر ہوتی ہوئی رات اور دیر سے نکلنے والے دن کے انتظار کی اُداسی نے گہنا دیا ہے۔ ذرا دیکھئے تو اِس کتاب کی پہلی دو نظموں کے یہ چند مصرعے:

''سوادِ چشم میں
ٹھہرا ہوا ہے خواب جو کب سے
مَیں بس اُس خواب کی تعبیر میں
مصروف رہتا ہوں۔''

(نظم ''بہت معروف رہتا ہوں'' ص:۱۶)

''کوئی خواب تھا
بڑا خوش نما
جسے اوڑھ کر
مَیں پڑا رہا
وہ جو خواب تھا
اُسی میں کہیں تھا
چھپا ہوا
کوئی جھوٹ بھی
اُسی خواب کا۔''

(نظم: ''دیر سے کھلنے والا راز'' ص:۱۷)

اور اِسی سے ملا کر دیکھئے اِس کتاب کی پہلی غزل کے اِس مطلع کو:

یہ جو خاک میں ہے مِلا ہوا، سرِ رہ گلاب گرا ہوا
ذرا دیکھنا کہیں یہ نہ ہو ترا میرا خواب گرا ہوا

تو اِس سے میری بات کی صداقت ہی ظاہر نہیں ہوتی' اِس حقیت کا ادراک بھی ہوتا ہے کہ ''دیر سے نکلنے والا دِن'' کس نوعیت کے خوابوں کا ثمر ہے اور اِس دن کے انتظار نے ہمارے خوابوں کے جمال اور صباحت کو کس کس طرح پامال کیا ہے۔

جاوید شاہین ایک خوش فکر شاعر ہونے کے باوصف' اپنے عہد' اپنی تاریخ اور اپنی ثقافت سے جُڑ کر آگے بڑھنے والا شاعر ہے۔ اِس لیے اُس کے شعری مجموعوں کے نام ایک خاص معنویت کے حامل ہوتے ہیں۔ ''زخمِ مسلسل کی ہری شاخ'' ہو یا ''صبح سے ملاقات''؛ ''نیکیوں سے خالی شہر'' ہو یا ''دیر سے نکلنے والا دن'' ان سب کتابوں کی تخلیق کا زمانہ' ان کے نام اور شعری اثاثے کی معنویت کو جاننے کے لیے اصل کلید کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اُس کی کتابوں کے نام کہیں نہ کہیں ارضِ پاکستان کی تاریخ اور سیاسی وثقافتی سفر سے جُڑے ہیں۔ اپنے عصر سے ہم آہنگ ہونے کی یہ خصوصیت صرف اُس کی کتابوں کے ناموں تک محدود نہیں۔ اُس کی شاعری کے مکمل وجود پر محیط ہے۔ تاہم اِس پہلو کی طرف دھیان بہت کچھ غور وفکر کے بعد ہی جاتا ہے وگرنہ شاعر کے اسلوب کی تہ داری' رمز وکنایہ سے کام لینے کی عادت اور پیش پا اُفتادہ مضامین سے گریز اور نئے اور انوکھے تجربات کی فراوانی اور تنوع نے اِس حقیقت پر بڑی ہنرمندی سے پردہ ڈال رکھا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اچھی شاعری کی ایک صفت اُس کا کثیر الجہات مفاہیم سے مملو ہونا بھی ہے۔

جاوید شاہین کے ناقدین اُس کے سیاسی اور سماجی شعور کا ادراک رکھنے اور اُس کے لہجے کی تازہ کاری کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتے اور حقیقت یہ ہے کہ ''دیر سے نکلنے والا دن'' بھی اِس صداقت کا پوری طرح امین ہے۔ نت دن بدلتی ہوئی دُنیا کی سرد مہری کو دھوپ کا ٹکڑا اچھا کر گرمانے والے شاعر کے کان لاحاصلی سے ہار کر آہ بھرنے والے دن کی مشکل سے سُنائی دینے والی آواز پر لگے ہیں تو بے وجہ نہیں لگے ہیں مگر اُس کے اندر' کہیں باطن میں یہ احساس بھی جاگزیں ہے کہ اِس کوشش کا ثمر' موجود کی بے معنویت کو معانی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اِس بے معنویت کو کسی نہ کسی سطح پر برقرار رکھنے کی آرزو بھی ہے کہ اِس سے خواب ہوتے ہوئے خوابوں کی طرف دیکھتے رہنے اور گم ہوتی ہوئی آسائشوں سے یک گونہ نسبت محسوس ہونے کے علاوہ خود رحمی کا پہلو بھی نکلتا ہے جو مقدر سے ہارے ہوئے لوگوں کی پسندیدہ سوغات ہے اور جس سے علاقہ رکھنا ہمارے عصر کی بنیادی شناخت ہے۔

مگر نہیں! جاوید شاہین کی شاعری کی اصل شناخت بے معنویت اور لاحاصلی کے احساس کا فروغ نہیں' اُس کا خاتمہ کرنا ہے۔ وہ تو نامکمل دِنوں کے کاٹھ کباڑ کو استعمال میں لا کر' جوڑ کر کوئی نیا دِن بنانے کا متمنی ہے۔ گو زوالِ عمر کی ساعت آنے پر اُسے اپنی یہ کوشش قدرے اضافی اور بے کار بھی محسوس ہوتی ہے اور اِس احساسِ زیاں سے بچ نکلنے کے لیے وہ ضرورت' بے ضرورت بولتے رہنے کا سہارا لینے پر مجبور ہوتا ہے جو سامع کی عدم توجہ کے باعث بالآخر خود کلامی میں تبدیل ہو جاتا ہے:

''دیکھو!
ایسے گھبرانے سے
اور دل چھوٹا کرنے سے

یہ جو باقی عمر پڑی ہے
کیسے کٹے گی
یہ جو پیچھے رہ جانے کا پچھتاوا ہے
اپنے ضائع ہونے کا دُکھ جو اتنا ہے
یہ سب کیا ہے؟
اس پر ٹھنڈے دل سے کبھی کیا سوچا ہے
کتنی دفعہ اِنصاف سے خود کو پَرکھا ہے
کتنے پانی میں ہو
کبھی یہ دیکھا ہے
ایک دفعہ ہمت سے ایسا کر لیتے
یہ بے کار کے دُکھ
جو تمہیں کھاتے رہتے ہیں
اُن کا مداوا کر لیتے۔''

(''خود کلامی''ص:۷)

مگر شاعر اپنی ہمت کو اِس طرح مجتمع کر پائے تو اُسے کوئی پچھتاوا ہی کیوں ہو! اِسی لیے ''کرنے والے کام'' اِس ساری کتاب میں بھی ''ان کیے'' ہی رہتے ہیں اور جاوید شاہین کے لیے شاعری کرتے رہنے کا جواز باقی رہتا ہے اور اُسے اِس حقیقت کا ادراک بہت دیر کے بعد ہوتا ہے کہ بڑی خوشی کے انتظار میں اُس نے کتنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ضائع کر دی ہیں۔

''دیر سے نکلنے والا دِن'' کی نظمیں موجود سے زیادہ باطنی ترفع کی تلاش کی نظمیں ہیں۔ موجود کا منظرنامہ' شاعر کے باطن کی تہ داری اور وسعت کی وضاحت کے لیے تشکیل پاتا ہے۔ اِردگرد کے دُکھ اور قابو میں نہ آنے والی آسائش' اندر کی توڑ پھوڑ اور انتشار کو نمایاں کرتے ہیں اور شاعر اپنے تخلیقی کمال کی جادوگری سے اِن دونوں دنیاؤں کو آپس میں ایک ہوتے اور علیحدہ کر کے واپس اپنی اپنی جگہوں پر آویزاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی دیر تک رہنے والی رات کی تاریکی کو کاٹ کر اور کبھی ''دیر سے نکلنے والے دن'' کے اُجالے کو نمایاں کر کے مگر ہر دو سطحوں پر یہ کتاب شاعر کے موجود اور اُس کے باطن سے جڑی رہتی ہے اور اُس کا اسرار اپنے جمال کی خبر دیتا ہے۔

''دیر سے نکلنے والا دِن'' کی غزلیں شاعر کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا زیاں ہونے کے بعد آغاز ہوتی ہیں۔ اِس لیے اُن کے وجود میں گم ہوتی ہوئی آسائشوں سے نمو کرتے حزن کی آمیزش ہے اور ظاہر و باطن کی شکستگی کی دل گدازئے کا اثر۔ اِس بات سے جہاں ان غزلوں کی تاثیر میں اضافہ ہوا ہے وہیں یہ ایک نئے اور قدرے نامانوس منظرنامے کی تشکیل کا سبب بھی

بنی ہے، جو شاعر کو غزل کی عمومی روایت اور مجموعی مزاج سے گریز کی راہ دکھا کر اُسے نئے مضامین باندھنے میں مدد بھی دیتا ہے۔ چند شعر دیکھئے:

چمٹا ہے بادباں سے جو طوفاں اُتار دوں
بیٹھا ہوا سفینے میں دریا نکال دوں

دریا جو چپ ہے اِس قدر، دیتا نہیں ہے کچھ خبر
پانی ہے یا کہ سطح پر صرف سراب رہ گیا!

کیا کارِ عشق تمام جب، جو تھا اِس میں جھوٹ وہ سب کا سب
کہیں اپنی ذات پہ لے لیا، کہیں تیرے نام پہ رکھ دیا

ایسی بدلی ہے بودوباش یہاں
گھر بنانا پڑا مکاں سے پرے

کسی بھی رُت کو اجازت نہ تھی ٹھہرنے کی
خلل عجب سا کوئی ماہ و سال میں رکھا

حنیف رامے نے جاوید شاہین کی شاعری کو سچ کی خوشبو کا حامل قرار دیا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا کہ جاوید شاہین کی شاعری کے سرسری مطالعے سے بھی اِس رائے تک پہنچنا مشکل نہیں۔ جاوید شاہین کی غزل کے کردار روایتی نہیں اور اُن کی ہر اَدا آج کے اِنسان کے طرزِ عمل کا پرتو محسوس ہوتی ہے۔ اُس کی شاعری کا ہر مصرعہ اپنے عصر، اپنے موجود اور اپنے زمانے سے جُڑا ہے اور اُس کی بنیاد کسی نہ کسی صداقت پر ہے۔ جاوید شاہین نے اِسی طرح کے اظہار میں ہر طرح کے ابہام سے محفوظ رہنے کی کوشش کی ہے۔ اِس نوعیت کی سچائی اور راست گوئی کو شعار بنانے میں اصل خطرہ اِس بات کا تھا کہ جاوید شاہین کی شاعری کہیں ''آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی'' کی مثال بن کر نہ رہ جائے اور اُس کے قاری اُس کی شاعری کو جھوٹ پکڑنے والے آلے کے طور پر استعمال نہ کرنے لگیں مگر اپنے اسلوب کی ندرت اور اپنی ذات اور اپنے موجود کے باطن میں اُتر کر اُس کی انفرادیت کو ظاہر کرنے کی سعی کے باعث، سچ اور صرف سچ سے علاقہ رکھنے کے باوجود اُس کی شاعری یک سطحی اور عمومی نہیں ہو پائی اور اُس کا ذائقہ اُردو شاعری کے مجموعی ذائقے سے الگ اور یکسر انوکھا ہے۔ یعنی جاوید شاہین کی شاعری کی دُنیا ہمارے اِردگرد کی دُنیا ہے مگر اِس دنیا کے شب و روز، فضا، رنگ اور موسم کچھ اور ہی طرح کے ہیں۔ اُس کے کردار ہماری طرح کے انسان ہو کر بھی کسی نہ کسی طرح ہم سے الگ اور مختلف ہیں اور اِسی بنیاد پر اُن کے سچ اور اُن کے جھوٹ بھی۔

کُونیات اور کائنات کی حقیقت اور کیفیت کا اِدراک اور اُس میں کوئی کردار ادا کرنے کی کوشش، جاوید شاہین کی شاعری اور ذات کا مرکزی حوالہ ہے۔ اِس کوشش میں کبھی کبھی تو وہ شاعر کی سطح سے اُوپر اُٹھ کر مظاہر کے خالق کی سطح پر فائز

ہونے کی کوشش کرتا بھی دِکھائی دیتا ہے۔ مناظر، موسموں، موجودات اور مظاہر کو آپس میں جوڑنے اور الگ کر کے ایک نئی اور انوکھی صورت دینا، اگر شاعر کے بس میں ہوتا تو ہمارے اردگرد کی دنیا کبھی کی بدل گئی ہوتی یا کم از کم اِس کی موجودہ صورت میں کوئی اور ہی صورت ضرور جلوہ نما ہوتی مگر خوشی اِس بات کی ہے کہ شاعر اِس تناسب اور کیمیا کو بدلنے کی خواہش رکھتا ہے، طاقت نہیں۔ جاوید شاہین بھی یہ سب کچھ بدلنے پر قادر نہیں پھر بھی اُس کی کتاب میں نظر آنے والی کائنات اپنی فطرت میں کچھ الگ اور اپنے اصل میں کچھ نئی ہے اور اِسی لیے جاوید شاہین کی غزل تکرارِ معنی کا شکار نہیں ہو پائی۔

جاوید شاہین کی شاعری کا ایک بہت واضح استعارہ ''کھڑکی'' (دریچہ) ہے۔ کبھی یہ کھڑکی دِن اور رات کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے اور کبھی باہر اور اندر کی دُنیا کو۔ جاوید شاہین کا ٹھکانا ہمیشہ اِس کھڑکی کے اِس طرف رہا ہے۔ اِس لیے باہر کی دُنیا سے اُس کا تعلق کمزور اور بصری منظر نامے تک محدود محسوس ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ کھڑکی میں جڑے شیشے سے آنکھیں لگائے باہر کی دنیا اور اُس کے مظاہر کو دیکھ تو رہا ہو مگر اس کی ماہیئت کو جاننے اور اُس کے وجود کو چھو کر دیکھنے سے معذور ہو۔ ایک ایسے زندانی کی طرح، جو اپنے وجود کی قید سے آزاد ہوئے بغیر باہر کی دنیا میں قدم رکھنے پر قادر نہ ہو، ماسوائے خواب کے وسیلے سے، جو وجود اور موجود دونوں کی حقیقت کو خیال میں بدلنے کی طاقت رکھتا ہے اور شاعر کے لیے نامعلوم اور ناموجود کی دُنیا میں اُترنے کا دَر وا کرتا ہے۔ اِسی لیے جاوید شاہین نے خواب سے اپنے رشتے کو کبھی کمزور پڑنے نہیں دیا اور اُس کی شاعری میں ناموجود اور نابود کا دَر وا کرنے کی یہ کوشش، کتاب کے اکثر صفحات پر بے تکلّفانہ بکھری ہوئی نظر آتی ہے:

اشجار، سائے، راہگزر سب ہیں خواب
اور اُن کے ساتھ اہلِ سفر سب ہیں خواب میں
یہ بحر، یہ ہَوا، یہ پہاڑوں کے سلسلے
بیدار لگ رہے ہیں مگر سب ہیں خواب میں

جو اُٹھ گیا ہے اصل میں ہے اعتبارِ ذات
مَیں ہوں مگر نہ ہونے کا ڈر چھوڑتا نہیں

اُسی نے مجھے ہے مری حدوں میں رکھا ہوا
مرے دیکھنے کو جو آئنہ یہیں ہے کہیں

غرض حاصل نہیں بے معرفی اپنی چھپانے کو
برائے باغبانی کوئی صحرا ساتھ رکھتا ہوں

مَیں نے جاوید شاہین کو ذات کا زندانی کہا ہے۔ اس سے قارئین کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ جاوید شاہین کا باہر کی دنیا اور اُس سے بھی آگے بڑھ کر کائناتی مظاہر کا مشاہدہ بہت محدود ہوگا۔ ایسا ممکن ہوسکتا تھا اگر جاوید شاہین نے ذات کے زنداں

کو اپنے گرد پھیلاتے ہوئے باہر کی دُنیا اور تمام تر کائنات کو اپنے باطن میں سمو نہ لیا ہوتا۔ اِس لیے اِس روز بروز بدلتی ہوئی کائنات سے اُس کا تعلق کسی نہ کسی سطح پر اُس کے باطن سے جڑا محسوس ہوتا ہے۔ اُس کے لہجے میں جو ذرا سی کڑواہٹ ہے وہ شاید اندر کی کائنات کا باہر کی کائنات سے تقابل کرنے کی کوشش کے باعث ہے۔ کیوں کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان دونوں کائناتوں میں فاصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جاتا ہے اور شاعر کے لیے اِن میں سے کسی ایک کو آئنہ بنا کر دوسری کے رنگ ڈھنگ، خوشبو اور ذائقے کی شناخت کرنا دُشوار تر ہوتا جاتا ہے۔ اِس بڑھتے ہوئے تفاوت کے باعث کہیں کہیں جاوید شاہین کے یہاں زبان و بیان کی سطح پر ایک خاص طرح کے کھردرے پن اور لہجے میں نامعلوم سی تلخی کا احساس ہوتا ہے مگر اشیاء اور مظاہر کو ایک الگ ہی انداز سے دیکھنے اور سمجھنے کی انفرادیت کے باعث وہ جاوید شاہین کی شاعری کی مجموعی لطافت کو گُند نہیں کرنے پاتی۔

پرندوں کے آنے کا ہے منتظر
صداؤں سے خالی مکان شام کا

میں کرتا رہا جمع ہر پیاس کو
کہیں ایک دریا نظر میں رہا

میں ہی بنتا ہوں فسادِ آب و گل کا ہر سبب
کس قدر نقصان میرا میرے ہونے سے ہوا

لیٹے تھے سایے گھاس پر اور ان کے پاس ہی
ستا رہی تھی دھوپ بھی اشجار کی طرف

حیراں تھا محنتوں کا پھل، جاتا کہاں ہے سب کا سب
دیکھا تو دستِ بے ہنر شاخِ ثمر کے پاس تھا

''دیر سے نکلنے والا دِن'' کی شاعری کا خمیر اِسی دُنیا، اِسی زمین سے اُٹھا ہے۔ یہ شاعری ایک کشادہ دِل اور کھلا ذہن رکھنے والے شخص کی شاعری ہے جو جبر اور یکسانیت کے ماحول کو بدلنے کی تمنا بھی رکھتا ہے اور صلاحیت بھی یہ خرد افروزی کی راہ پر چلنے والے اور روشن خیالی سے اپنے معاشرے کو آسودہ دیکھنے کی آرزو پالنے والے شخص کی شاعری ہے، اس لیے اِس کتاب میں رات کے ساتھ ہی کہیں بھی دِن کے اُجالے پر غالب آتی محسوس نہیں ہوتی۔ دیر ہی سے سہی مگر جاوید شاہین کی اِس کتاب میں وہ دِن بالآخر نکل آیا ہے، جس کی نوید ''صبح سے ملاقات'' کے دِنوں میں ملی تھی اور جسے ''محراب میں آنکھیں'' اور ''نیکیوں سے خالی شہر'' جیسی کتابوں میں دَر آنے والے تیرگی، جسے جیلانی کامران نے تسامح کی بنیاد پر ایک تخلیقی نسل کا المیہ قرار دیا تھا، نے دُھندلانے اور بے چراغ کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر جاوید شاہین ایک ''جاگتا لمحہ'' کی اُنگلی پکڑ کر رات کے دوسرے

کنارے پر آن پہنچے ہیں۔اب اُن کے سامنے صرف اور صرف دن کا اُجالا ہے اور رات ماضی کا ایک حوالہ بن کر کہیں پیچھے رہ گئی ہے۔

وہ حرکت سے عاری کڑی رات تھی
کوئی میخ بن کر گڑی رات تھی

تھکا چاند لیٹا تھا دِن کو جہاں
وہیں دھوپ اوڑھے پڑی رات تھی

مرے گھر کی دہلیز پر صبح دم
کسی لاش صورت پڑی رات تھی

بندھے جس میں تھے سب مظاہر یہاں
اُسی سلسلے کی کڑی رات تھی

باقی رہی سماجی، سیاسی اور ابدی صداقتوں کے بیان کرنے کی بات تو یہ سب تو جاوید شاہین کی شاعری کا عمومی حوالہ ہے ہی۔''دیر سے نکلنے والا دِن'' کی شاعری بھی ان اوصاف سے لبریز ہے مگر اس سے بھی بڑا حوالہ اِس کتاب کا خواب کے دُھند لکے سے باہر نکل کر دِن کے اُجالے میں سفر آغاز کرنے کا ہے اور اِس بنیاد پر توقع کی جا سکتی ہے کہ جاوید شاہین کا اگلا شعری مجموعہ اُس تلخی، یاسیت اور احساسِ زیاں سے پاک ہوگا، جس کا سایہ اُن کی اب تک کی شاعری پر کسی نہ کسی سطح پر موجود رہا ہے اور جس کی جھلک کہیں نہ کہیں ''دیر سے نکلنے والا دِن'' کے صفحات میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

☆☆☆

مرنے سے انکاری قاضی شاہد کی کہانی

ڈاکٹر انوار احمد

پوری کالونی میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی، حالانکہ یہ نسبتاً پرسکون کالونی مشہور تھی، یہاں کتابی علم رکھنے والوں کی رہائش تھی، وہ ضابطہ پسند لوگ تھے، محنت مشقت کر کے انہوں نے مطلوبہ تعلیمی ڈگری حاصل کی قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری پر نوکری پائی اور شادی کی، کفایت سے بچے پیدا کئے ناظم تقدیر کے جاری کردہ راشن کارڈ کے مطابق محبت کی، ہر حاکم کی اطاعت کی، نصابی کتاب، افسر اور بیوی کی نافرمانی کا خیال کبھی دل میں نہیں لائے، زیادہ تر شائستہ زبان بولی، عوامی سطح پر رواج پا جانے والے محاوروں اور ترکیبوں کے معانی کی کھوج کبھی نہیں لگائی۔ اپنے گھر میں مہمان اگر بلائے تو ''انٹرنس کنٹرول لسٹ'' کے مطابق، ان کے ساتھ بھی کبھی جمہوریت کی بحالی، بے حالی یا بدحالی پر کبھی گفتگو نہیں کی۔ نظریۂ پاکستان سے اپنی لگاؤ کو برقرار رکھنے کے لئے صرف 'نوائے وقت' اخبار پڑھا، کبھی وہ اس بحث میں نہیں پڑے کہ انقلابِ ایران کے بعد عرب ملوکیت نے ایرانی گرم جوش سخاوت کے مقابل دریا دلی کا مظاہرہ کر کے ان کے پرسکون شہر مدینۃ الاولیاء میں شیعہ سنی امتیاز کو خونیں رنگ کیوں دے دیا؟ کبھی ان کے سامنے سی آئی اے، طالبان، ہیروئن، کلاشنکوف اپنے وطن کے مہم جو جرنیل اور اسلامی نشاۃ الثانیہ کا موضوع اول تو چھڑا نہیں کہ ان کے سبھی ملنے والے انہی کی طرح کے مستقیمے لوگ تھے اور اگر کبھی کبھار بھولے سے کسی نے اس جانب اشارہ بھی کر دیا تو شعبان صاحب کھسیانی ہنسی کے ساتھ ''رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند'' کہہ کر اپنی فارسی دانی اور عافیت پسندی کا مظاہرہ کرتے۔ (مظاہرہ ذرا ناموزوں لفظ ہے کہ وہ مظاہرہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے) اب یہاں سارے فارسی دان تھے یا نہیں تھے البتہ عافیت پسند ضرور تھے تاریخ میں سے انہوں نے صرف اتنی باتیں یاد رکھی تھیں، جو نسیم حجازی کے ناول پڑھنے، ازدواجی زندگی کو ہموار رکھنے اور کولسٹرول لیول کو قابو میں رکھنے کے لئے ضروری تھیں، مگر اب قاضی شاہد کے غیر معمولی رویے نے سننے اور دیکھنے والوں کے کان اور آنکھیں کھول دی تھیں، حالانکہ گزشتہ دو عشروں سے قاضی شاہد بھی کالونی والوں کے معمولات کا ایک جزو تھے۔

یہ نہیں تھا کہ اس کالونی میں روبوٹ رہتے تھے یا ان کی امتیازی شناخت نہیں تھی، ان کی علیحدہ علیحدہ شکلیں اور ناک نقشے تھے، اپنے اپنے سنجیدہ نام اور نیم سنجیدہ عرفیتیں تھیں، الگ الگ بیویاں اور غیر مشترک بچے تھے، مکانوں کی ساخت بھی ایسی

جدا تھی کہ بعض سرکاری ادارے اسے کالونی کا درجہ دینے سے جھجکتے تھے۔ کچھ کوٹ پتلون' کچھ کُرتے پاجامہ اور کچھ شلوار قمیض میں ملبوس رہتے' ایک آدھ تو گرمیوں میں بنیان' نیکر پہنے بھی دکھائی دے جاتے۔ ان میں ایک دو' یو پی سے آٹھ دس مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے ملتان آ گئے تھے' تین چار کرائے کے مکان بدل کر اور الاٹ شدہ گھر بیچ کر اس کالونی میں کسی حد تک اپنی ضرورتوں اور حسرتوں کے مطابق بنائے گئے مکان میں چلے آئے تھے۔ ایک ۱۶/دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان سے آئے تھے اور ان کے احتجاج کے باوجود کالونی کے بچے انہیں بنگالی کہتے تھے۔ کچھ سرگودھا اور میانوالی کی طرف کے پنجابی زمیندار تھے اور باقی مقامی سرائیکی تھے مگر کم وبیش سب کے بچے اردو بولتے تھے کہ روانی سے انگریزی بول نہیں سکتے تھے یا ان کی ماؤں کو یہ پسند نہیں تھا کہ انگریزی ان کی اولاد کی مادری زبان کہلائے۔ ان میں کوئی مسجد میں جا کر نماز پڑھتا تھا اور رفع یدین کرتا تھا یا نہیں کرتا تھا' کوئی اپنے گھر میں آہستہ سے یا زور سے آمین کہتا تھا اور کوئی اللہ کے بحرِ رحمت ہونے سے تصور سے وابستہ تھا' پرمحتاط اور پرامن سارے تھے' ہاتھ' پاؤں' زبان اور دیگر اعضا نپے تلے انداز میں استعمال والے' کبھی ایجنسیوں' بیویوں اور حکیموں کے زیرِ تفتیش رہنے کی نوبت نہیں آئی تھی' زیادہ تر پروفیسر اور پروفیسر نما تھے' ایک دو بینک آفیسر' چار پانچ کم مشہور محکموں کے ملازم اور تین ڈاکٹر تھے' جن میں سے ایک نے ایف ایس سی کے امتحان میں دسویں مرتبہ جا کے مطلوبہ نمبر حاصل کئے تھے' اس لئے کلینک سے زیادہ ان کا ٹیوشن سنٹر چلتا تھا' کم بیش سبھی نے اپنے بچوں کی تعلیم' ان کی خوشنودی اور کیئریر پر اپنے وسائل سے بڑھ کر خرچ کیا تھا اور غالباً بھاگ دوڑ بھی کی تھی کہ ان کے بچے زیادہ خوبصورت زیادہ تعلیم یافتہ اور' حکمران قدروں سے زیادہ قریب تر اور زیادہ محفوظ ہو جائیں۔ قاضی شاہد ایک بھولے بھالے پروفیسر' اطاعت گزار والد اور وفا پیشہ شوہر تھے' مفت کی بھی نہیں پیتے تھے' ان کے چوہوں کا تو پتہ نہیں البتہ ان کی بیگم اتنی سیانی تھیں کہ دوسری کالونی کی بعض بیگمات ان سے شوہر کو قابو میں رکھنے کی تدابیر پوچھا کرتی تھیں۔

آس پاس کی دنیا کے اثرات ایک مہذب چھلنی میں سے گذر کر اس کالونی میں پہنچتے تھے' اس لئے غیر معمولی واقعات یہاں خال خال ہی ہوتے تھے' خواتین محفل میلاد پر ہی اکتفا کر لیتی تھیں' کئی برس میں مشکل سے تین چار ہی قابلِ ذکر واقعات نے کالونی میں زندگی کا معمول توڑا تو نہیں تھا' بس اس میں ذرا سا تعطّل یا سکتہ آیا تھا' ایک تو ریٹائرڈ پرنسپل قدوس میاں کے گھر پولیس آئی تھی کہ ان کے جانشین بننے والے نانجار شاگرد نے اینٹی کرپشن والوں کو رشوت دے کر کالج کے ایک گمشدہ درخت کا رشتہ قدوس میاں کی بیٹی کے جہیز میں دیئے جانے والے فرنیچر سے جوڑنے کی کوشش کی تھی' دوسرے ڈاکٹر جبار کی بہو کو طلاق ہو گئی تھی' مگر خلقِ خدا کی زبان کے نقارہ بننے سے پہلے صلح ہو گئی اور پھر صلح کے ایک آدھ مہینے کے بعد وہ نوجوان خاتون اچانک چل بسی' ایک دو سرگوشیوں سے زیادہ اس موت نے کوئی ہلچل پیدا نہ کی-- تیسرا اور چوتھا واقعہ بھی کچھ ایسا تھا کہ کسی محلے میں ہوتا تو چند مہینوں تک موضوعِ گفتگو رہتا' مگر یہاں وہ سیلن زدہ پھلجھڑی ہی ثابت ہوا' اس کا سبب یہاں رہنے والے لوگوں کی شرافت طبعی' مصروفیات' مطلوبہ ذخیرۂ الفاظ کی کمی یا ہر قسم کے حالات سے مفاہمت کی عادت تھی۔ دنیا میں بہت سے لوگ' گھر اور بستیاں ایسی ہیں کہ آپ ان کے آئندہ چلن کی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ مگر یہاں آپ آسانی سے کہہ

سکتے تھے کہ شعبان صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتے رہیں گے، حج کریں گے اور داڑھی رکھ کر فوت ہو جائیں گے، بیوہ اور بچے ان کی جان کو زیادہ نہیں روئیں گے کہ انہوں نے ہر ایک کے لئے ایک ایک پلاٹ اور پالیسی لے رکھی ہے۔ یہی کچھ حال شیخ رمضان کا تھا، وہ اپنے سمدھی کے اس پارٹنر تک کو خود سے بہتر انسان خیال کرتے تھے، جو ان کی سمدھن کو چند ہفتوں کے لئے بھوربن لے گیا تھا، مگر واپسی پر اس سارے سفر کو ممتاز مفتیانہ قسم کی روحانی واردات میں تبدیل کر دیا تھا، ان کے احوال واطوار اور لب و لہجے میں آئندہ برسوں میں کسی قسم کی بڑی تبدیلی کے کوئی آثار نہیں تھے، یوں سمجھ لیجئے کہ اس کالونی کے لوگوں کی عادات ایسی پختہ ہو چکی تھیں کہ بیرونی واقعات کا تو ذکر ہی جانے دیں، ضعفِ قویٰ کے سبب عینک کے نمبر یا مصنوعی دانت کی تعداد میں زیادتی وغیرہ بھی ان کے معمولات میں تغیر پیدا کرنے سے قاصر تھی، مگر قاضی شاہد نے اس معمول کو توڑ کر نوجوانوں کو مشتعل اور خواتینِ خانہ کو برہم کر دیا تھا۔

عام طور پر اس کالونی کے گھر مردوں کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے، مگر دو گھر ایسے تھے، جنکی مالکین بیوہ ہو گئی تھی، مگر وہ بیوہ ہونے سے بھی پہلے تمام امور کی نگران تھیں، اس لئے ان کے معمول میں بھی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ عدت کی تخفیف کے حوالے سے بھی انہوں نے ایک فتویٰ فوٹوسٹیٹ کرا کے کالونی کے لطیف جنرل سٹو پر بیٹھے ایک دو کثیف لوگوں کے لئے بھجوا دیا تھا، ان میں ڈاکٹر نسیم تھیں، جنہیں کبھی کبھار میلاد شریف کی محفلوں میں بعض تیز یادداشت کی خواتین سرگوشیوں میں لیڈی ہیلتھ وزیٹر کہتیں، دوسری ایک مقامی کالج میں اسلامیات کی لیکچرار تھیں، دس برس پہلے ایک سکول ٹیچر سے شادی کی تھی مگر ایک گم شدہ کزن کے تاخیر سے ملنے والے عاشقانہ رقعے کی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی، وہ کزن تو واپس نہیں آیا، مگر انہیں اپنا پرانا نام واپس مل گیا، مس فہیم! میلاد کی محفلوں میں وہ خواتین کو باور کرایا کرتی تھیں کہ قیامت بہت قریب آ چکی ہے۔ مگر قاضی شاہد کے گھر میں یہ قیامت آ چکی تھی، ہوا یہ تھا کہ انہوں نے حیرت انگیز طور پر خضاب، لباس اور لمبی سیر پر توجہ دینی شروع کر دی تھی، بیگم صاحبہ حج کرنے گئیں اور منٰی کی بھگدڑ میں شہید ہو گئیں۔ قاضی شاہد کافی عرصہ عدت میں رہے، لوگوں سے ملنا ملانا چھوڑ دیا، پھر ایک دم سے کالونی کے لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے جب وہ ایک نئے قاضی شاہد سے متعارف ہوئے، پُر اعتماد انداز میں اپنے فیصلے کرنے والا ایک متحرک اور باعمل قاضی شاہد جس نے پہلے اپنی دو بیٹیوں کی شادی کی پھر اکلوتے بیٹے کو لاہور میں جا کر انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخل کرایا اور اس کے بعد مس فہیم کے گھر میں جانا شروع کر دیا۔

قاضی شاہد کے اطوار میں ہی تبدیلی نہیں آئی تھی، مس فہیم اور ان کے ویران گھر میں بھی زندگی ہمکنے لگی تھی، گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر پڑنے والے نئے پردوں نے آس پاس والوں کے تجسّس میں اضافہ کر دیا تھا، مس فہیم کی ہنسی کی کھنک اور قاضی شاہد کے بانکپن نے کالونی کے وضع داروں کو چبھنا شروع کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ بات چوکیداروں، خواتین خانہ اور اطاعت گزار شوہروں سے نکل کر قاضی شاہد کی بیٹیوں کے سسرال اور وہاں سے شاید عالمِ ارواح تک پہنچ گئی تھی، کم و بیش ہر جمعرات کو قاضی شاہد اپنی مرحومہ بیگم کے جلالی لیکچر سے مرصع خواب دیکھنے لگے۔ چوتھے خواب کے بعد انہیں اپنی ایک بیٹی کا خط کراچی سے آیا، جس میں رسمی القاب و آداب کے بغیر یہ لکھا تھا'' آپ نے نہ صرف خاندان کا نام ڈبو دیا ہے، بلکہ سسرال میں

بھی مَیں کسی کومنہ دکھانے کے قابل نہیں رہی' اگر کل کلاں میرے شوہر نے بھی آپ کی روایت پرعمل شروع کر دیا' تو میرے وجود میں پلنے والے بچے کا کیا بنے گا؟ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کے جز دان میں پنج سورہے ہوتے تھے۔اللہ معاف کرے کالونی سے انکل سعید نے لکھا ہے کہ آپ کے پرس میں کنڈوم ہوتے ہیں' خدا مس فہیم کا بیڑا اور بھی غرق کرے وغیرہ وغیرہ'' پھر ایک دن قاضی شاہد کا بیٹا گھر میں آیا' اس کے رویے میں غیر معمولی تبدیلی تھی' وہ تلخ اور گستاخ دکھائی اور سنائی دیتا تھا' اس نے کہا''میرے دوستوں کا بھی یہی خیال ہے کہ آپ جیسے بزرگوں کو کیبل کے ذریعے علی الصبح دکھائے جانے والے ایک دو چینلوں کے پروگراموں نے گمراہ کیا ہے یا بزرگوں میں جنسی توفیق کے حوالے سے خود فریبی پیدا کرنے والے اشتہاروں نے آپ کو اپنی عاقبت خراب کرنے پر آمادہ کر دیا ہے'' اس کے بعد قاضی شاہد کے گھر سے ایک ایسی آواز سنائی دی جو اس سے پہلے کالونی میں کبھی نہیں گونجی تھی''ہم لوگوں نے ایک عرصے سے ایسے مقروض لوگوں کی زندگی گزاری ہے' جنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اصل قرض خواہ کون ہے؟ البتہ والدین کی خدمت' بیوی کی خوشنودی' بچوں کی دلنوازی' ہمسایوں کی خبر گیری اور پر امن یا ڈرپوک شہری کے طور پر ہر سرکار سے لرزہ براندامی وہ سود ہے جو ہم خاموشی سے ادا کرتے چلے جا رہے ہیں' سن لو میں تم لوگوں کی مرضی کے مطابق بہت جی لیا' اب میں اولاد' ہمسائے اور احباب کی منشاء کے مطابق مرنا نہیں چاہتا'' یہ آواز رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی پہلے یہ مس فہیم کے گھر تک پہنچی' جہاں کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے مرتعش ہوئے' پھر یہ پوری کالونی میں گونجی اور پھر شاید عالمِ ارواح میں بھی اس طرح سے پہنچی کہ پھر کبھی قاضی شاہد کو اپنی مرحومہ بیوی جلالی خواب میں نظر نہ آئیں۔

☆☆☆

ترکش کی کہانی

تیر کھائے ہوئے دل کی زبانی

عدیم ہاشمی

ترکش میری پہلی کتاب ہے، ظاہر ہے اس کتاب سے پہلے مجھے کسی قسم کا اشاعتی تجربہ نہیں تھا۔ اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اپنی کتاب کا دیباچہ خود بھی لکھا جا سکتا ہے یا دیباچہ نہ ہونے سے کتاب کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میرا خیال تھا کہ شاید دیباچے کے بغیر کتاب چھپ ہی نہیں سکتی اور اگر چھپ بھی جائے تو وہ کتاب شاعروں اور ادیبوں کی نظر میں کسی حیثیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ کتاب کا دیباچہ کسی بڑے بلکہ ملک کے سب سے بڑے دیباچہ نگار سے لکھوایا جائے۔ لہٰذا مارچ ۱۹۹۰ء میں مَیں اپنی کتاب ''ترکش'' کا مسودہ جناب احمد ندیم قاسمی کے پاس لے گیا اور ان سے اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی درخواست کی۔ اس لیے کہ یہ ساری وہ شاعری تھی جو ان کے رسالے ''فنون'' میں چھپ چکی تھی۔ بلکہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۹ء تک ۱۱ سال کے طویل عرصہ میں ''فنون'' کا کوئی شمارہ ایسا نہیں تھا جس میں میری غزلیں شاملِ اشاعت نہ ہوں اور مَیں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ان گیارہ برسوں میں سب شاعروں سے زیادہ میری غزلیں ماہنامہ ''فنون'' میں شائع ہوئیں۔۔۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میری چھ چھ اور آٹھ آٹھ اور دس دس غزلیں جو مَیں نے ندیم صاحب کو اس لیے دیں کہ سال بھر کے لیے مَیں ''فنون'' کی طرف سے سبکدوش ہو جاؤں اور مکمل فراغت کے ساتھ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لیے اتنا کام کروں کہ میری دو وقت کی روٹی کے ساتھ ساتھ کینٹین کا بل، پاک ٹی ہاؤس کا بل، سراج کھوکھے والے کے سگریٹوں کے پیسے اور رکشے والوں کے کرایہ کا قرض ادا کر کے اتنا ضرور بچا سکوں کہ رہنے کے لیے ایک آدھ کمرہ کرائے پر لینے کی حیثیت میں آ جاؤں۔۔۔لیکن ہر بار قاسمی صاحب نے تمام کی تمام غزلیں ایک ہی بار ''فنون'' میں شائع کر کے مجھے ''غزلی'' طور پر خالی ہاتھ کر دیا اور میرے ''بل'' ادا کرنے کے تمام خوبصورت خواب ہمیشہ خواب ہی رہے۔۔۔اس طرح ''ان گیارہ برسوں میں'' میری غزلیں ''فنون'' میں چھپنے والے سب شاعروں سے زیادہ شائع ہوئیں۔ پتہ نہیں مجھے ''فنون'' کی زیادہ ضرورت تھی کہ ''فنون'' کو میری غزلوں کی۔۔۔اور یوں بھی مَیں قاسمی صاحب کے ان عقیدت مندوں میں سے ہوں جس نے پہلی بار قاسمی

صاحب سے ہاتھ ملا کر کتنے دن ہاتھ نہیں دھوئے تا کہ ان کے ہاتھوں کا لمس میرے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ دیر تک رہ سکے۔ ان گیارہ برسوں میں تمام شاعر ادیب میرے تمام نوجوان ساتھیوں کی نسبت مجھے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور مجھ سے زیادہ محبت کرتے تھے۔۔۔ ممکن ہے یہ میری خوش فہمی ہو اور وہ سب نوجوانوں کو ایک جتنا ہی چاہتے ہوں لیکن مجھے یہی لگتا تھا کہ میں ان کی نگاہوں میں زیادہ مقبول ہوں۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ میرا دیباچہ قاسمی صاحب ضرور لکھ دیں گے۔۔۔ وہ یوں بھی ہرایرے غیرے کا فلیپ اور دیباچہ بڑی فراخ دلی سے لکھ دیتے ہیں اور میں تو ایروں غیروں میں شامل نہیں میں تو پورے کا پورا عدیم ہاشمی ہوں۔۔۔ میری کتاب کا دیباچہ لکھنے میں انھیں کیا انکار ہوگا۔۔۔ اگرچہ اس سے کچھ ہی عرصہ قبل میں ان کی ایک مالی ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ بہت عالی ظرف انسان ہیں اور انسان دوستی کی شاعری کرتے ہیں اور پھر انہوں نے لکھا تھا کہ اگر میں ان کی مالی ڈیمانڈ اس لیے پوری نہ کر سکوں کہ رقم زیادہ ہے تو انھیں کوئی ملال نہیں ہوگا اور اب اگر میں ان کی ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکا ہوں تو اس سے میری ادبی حیثیت یا میرے اور ان کے تعلقات میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔۔۔ لیکن ہوا یوں کہ انہوں نے میری کتاب کا مسودہ ایک خاص طرح کا Smile پاس کر کے اپنے پاس رکھ لیا جو ۱۹۹۰ء سے لے کر آج بھی ان کے پاس ہے۔۔۔ پھر اچانک دو سال گزر گئے تو مجھے لگا کہ وہ میری کتاب کا دیباچہ نہیں لکھیں گے۔۔۔ پھر واضح طور پر مجھے اپنے اور ان کے تعلق میں فرق محسوس ہونے لگا۔۔۔ پھر مجھے یہ بھی لگا کہ شاید وہ میرے بارے میں کوئی مثبت رائے دیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔۔۔ یا اس مالی ڈیمانڈ پوری نہ ہونے کے بعد میں ان شعراء کی فہرست میں سے خارج ہو چکا ہوں۔۔۔ یا یہ یا وہ یا ایسا یا ویسا۔ غرض کہ بہت سے اُلٹے سیدھے خیالات نے مجھے بے چین کیے رکھا اور نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ مَیں ان کی نظر میں اپنا مقام کھو چکا ہوں۔۔۔ اور پھر اچانک مجھے یہ خیال بھی آیا کہ انہوں نے بہت دیر تک شکیب جلالی مرحوم کا مسودہ بھی اپنے پاس ہی رہنے دیا تھا اور اس وقت تک ''روشنی اے روشنی'' شائع نہیں کی تھی جب تک کہ شکیب جلالی کا سٹائل عام نہیں ہو گیا تھا۔۔۔ مَیں جب امریکہ سے پلٹ کر آیا تو میرے شعر بھی اتنے عام ہو چکے تھے کہ اب اپنے شعر مجھے پُرانے اور Outdated محسوس ہونے لگے تھے۔۔۔ اور اب مزید تاخیر مجھے کسی طرح بھی گوارہ نہیں تھی۔ یہ دو سال جو مجھے صرف دیباچے کے انتظار میں گزارنے پڑے مجھے دو صدیوں پر چھائے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس عرصہ میں میرے کئی بار ''فنون'' کے دفتر جانے پر مجھے یہ تک نہیں کہا گیا کہ مَیں تمہارا دیباچہ لکھ دوں گا۔۔۔ بلکہ کبھی دیباچے کا تذکرہ تک نہیں کیا گیا۔۔۔ اس آہنی خاموشی کے بعد مَیں نے مناسب نہیں سمجھا کہ دیباچے کے بارے میں کچھ دریافت کروں اور اپنے پبلشر کو کہہ دیا کہ وہ میری کتاب بغیر دیباچے کے چھاپ دے۔ میری کتاب میں اگر ملک کے سب سے بڑے دیباچہ نگار کا دیباچہ نہیں ہے تو یہ میری مجبوری ہے اور مَیں نے پبلشر کو بتا دیا کہ اب وہ میری کتاب کا دیباچہ نہیں لکھیں گے۔

اس لیے کہ نہ تو اب میں وہ عدیم ہاشمی ہوں جو امریکہ جانے سے پہلے تھا۔ نہ اب مَیں ان کے بیعت کرنے والوں میں سے ہوں۔ نہ میں کوئی بیوروکریٹ ہوں نہ انھیں مجھ سے کوئی مطلب ہے۔ (جو تھا وہ پورا نہیں ہو سکا) نہ مَیں کوئی خوبصورت لڑکی ہوں۔ (خوبصورت کا لفظ صرف اس لیے لکھ دیا ہے کہ جملہ اچھا لگے) ویسے بھی اب وہ زمانہ تو نہیں کہ جناب

احمد ندیم قاسمی کسی خوبصورت لڑکی ہی کو منہ بولی بیٹی یا شاگرد بنائیں۔ اب تو بس لڑکی ہو یہی کافی ہے اور میری مجبوری کہ مَیں لڑکی نہیں ہوں (ویسے حیرت ہے کہ جناب احمد ندیم قاسمی نے بہت سی بہنیں اور بہت سی بیٹیاں بنائیں لیکن آج تک کوئی منہ بولا بیٹا نہیں بنایا حالانکہ بہت سے نوجوان شاعران کے ہاتھوں پروان چڑھے حتیٰ کہ امجد اور عطا بھی یہ مقام حاصل نہ کر سکے۔ وہ بھی صرف ان کی بیساکھیاں بنے اور انھیں اپنی بیساکھی بنایا لیکن بیٹے وہ اپنے باپ کے ہی رہے) مقامات انہوں نے حاصل کیے تو خود یہ تو نہیں کیا کہ ندیم صاحب کو سفیر بنوا دیا۔ سفارت اپنے پاس ہی رکھی۔ یہاں انہوں نے قاسمی صاحب کو صرف قاسمی صاحب ہی رہنے دیا۔ بہرحال یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے وہ جانیں اور وہ۔ مَیں تو ترکش کے اس دیباچے کے بارے میں لکھ رہا ہوں جو نہیں لکھا گیا اور وجوہات بیان کر رہا ہوں دیباچہ نہ لکھے جانے کی؛ جس کی ایک وجہ منہ بولا رشتہ بھی ہو سکتا ہے منہ بولے رشتوں سے تو جناب احمد ندیم قاسمی کو مثالی محبت ہے اور ان کی منہ بولی بیٹی سے محبت کا یہ عالم ہے کہ آخری بار سُنا ہے جب وہ اکیلے عمرہ کر کے واپس پاکستان آئے تو اپنے گھر نہیں گئے سیدھے منہ بولی بیٹی کے گھر ہی پہنچے۔ یہ ان کے منہ بولے رشتے سے محبت کی ناقابل بیان مثال ہے ایسی ناقابلِ فراموش کہ ان کی اپنی اہلیہ محترمہ اس محبت کی تاب نہ لا سکیں۔ ان کی ساری فیملی اس محبت پر حیرت زدہ ہے؛ بلکہ سارا لاہور انگشتِ بدنداں ہے۔ ایسی محبت دنیا میں کوئی کوئی ہی کر سکتا ہے کہ اپنی اصلی بیٹی کے ہوتے ہوئے منہ بولی بیٹی کو محبت کے ''جنون'' سے لے کر ''فنون'' تک سب کچھ عطا کر دے۔

یہ جناب احمد ندیم قاسمی کی محبت اور کردار کی عظمت ہے کہ انہوں نے پروین شاکر کے بعد اگر کسی کو بیٹی بنایا تو صرف اور صرف محبت اور تعلق کی بنا پر بنایا۔ یہ نہیں دیکھا کہ وہ خوبصورت ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ خدانخواستہ یہ کوئی Affair تو نہیں باپ اور بیٹی کی محبت ہے اور منہ بولی بیٹی جیسی بھی ہے بس بیٹی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس رشتے کی محبت کو اس انتہا تک پہنچایا کہ اصلی بیٹی پیچھے رہ گئی اور منہ بولی آگے نکل گئی۔ یہاں تک کہ پروین شاکر کی پہلی برسی پر اسلام آباد میں تو فرطِ جذبات میں انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ میری تین بیٹیاں ہیں ایک پروین جو اسلام آباد حادثے میں اللہ کو پیاری ہو گئی ایک نشاط جو ہاتھ کے آپریشن میں بدقسمتی کا شکار ہو کر انتقال کر گئی اور تیسری میری منہ بولی جو ہر وقت اور ہر قدم پر میرے ساتھ ساتھ ہے۔

ایسی لازوال محبت ہر کسی کے نصیب میں تو نہیں ہو سکتی کہ منہ بولا باپ اپنی منہ بولی بیٹی کی محبت کی سرشاری میں بھول ہی جائے کہ اس کی کوئی چوتھی بیٹی بھی ہے جو زندہ بھی ہے اور اصلی بھی ہے اور صرف ایک بھائی کی ایک ہی بچی ہوئی بہن بھی ہے؛ پھر محبت کی اور منہ بولے رشتے کی یہ لافانی مثال اس طرح بھی قائم کی کہ اپنی اسیویں سالگرہ کے موقع پر سٹیج کی نشستوں میں اپنے بازو والی مسند پر منہ بولی بیٹی براجمان ہوئی اور اصلی بیٹی نے عوام میں بیٹھ کر باپ کو دُور ہی سے فنکشن کا ''دولہا'' بنے دیکھا۔ حالانکہ شاعرہ منہ بولی بیٹی بھی ہے اور اصلی بیٹی بھی اور اصلی بیٹی اصلی شاعرہ بھی ہے۔ مَیں تو کہتا ہوں یہ انسانی محبت کی مثال کم اور فرشتہ ہونے کا مقام زیادہ ہے۔

اس منہ بولے رشتے کے لیے جناب احمد ندیم قاسمی کی قربانیوں کا یہ عالم ہے کہ بہت سے دوست اور ''فنون'' کے ''معمار احباب'' منہ بولی بیٹی کے تعلق پر وار دیئے گئے۔ خالد احمد رہا نہ نجیب احمد نہ دوسرے بہت سے ساتھی جو فنون کے ستون

تھے جنھیں ''فنون'' کا جنون تھا جنھوں نے لہو کے قطرے قطرے کی طرح قلم کے لفظ لفظ سے ''فنون'' کو ادبی دنیا میں اردو ادب کے سب سے بڑے جریدے کا مقام دلوایا اور فنون کی ادارت جناب قاسمی صاحب سے ملی تو منہ بولی بیٹی کو۔۔۔ باقی سب کو حبیب اشعر کے بعد اپنا سا منہ لے کر رہ جانا پڑا۔۔۔

کیا ہوا جو منہ بولی کو ادارت کا کوئی تجربہ نہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی کا تجربہ کس دن کام آئے گا۔۔۔ کیا ہوا جو منہ بولی کا کوئی نام نہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے نام کس دن کے لیے کمایا ہے!! کیا ہوا جو منہ بولی کا شاعری میں کوئی مقام نہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی کا مقام اتنا تو ہے نا کہ منہ بولی کو زمین سے اُٹھا کر ''فنون'' کے منبر کی اونچائی تک لے جایا جا سکے۔

کیا ہوا اگر خالد احمد میں ''فنون'' کا مدیر بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں منہ بولی بیٹی میں بھی یہ صلاحیتیں ''فسون ندیم'' سے فنون ندیم کے لیے ایک پل میں پیدا ہو جائیں گی۔

کیا ہوا اگر خالد احمد کے تعلقات ملک بھر کے شاعروں اور ادیبوں سے موجود ہیں اور خالد احمد کو پاک و ہند کے تمام لکھنے والے بہ حیثیت ایک اعلیٰ شاعر کے جانتے ہیں تو ندیم صاحب کی بدولت ان کی منہ بولی کو بھی برصغیر کے تمام رائٹرز جان جائیں گے اور پھر سب لوگ جان بھی گئے۔ ''پہچان بھی گئے۔''

بس یہ ہے کہ خالد احمد اور نجیب احمد کو یہ نام برسوں کی مشقت سے کمانا پڑا اور منہ بولی بیٹی کو باپ کی کمائی سے Over Night یہ نام ورثے میں حاصل ہو گیا اور ویسے بھی دنیا کے ہر قانون میں ہر طرح کی جائیداد کوئی بھی صاحبِ وراثت کسی کو بھی ورثے میں پیش کر سکتا ہے بس فرق یہ ہے کہ مادی جائیداد وصیت کے مطابق مرنے کے بعد نامزد وارث کو مل سکتی ہے اور ادبی جائیداد زندگی میں ہی Cash ہو سکتی ہے جو منہ بولی بیٹی نے دخترانہ محبت کی چابکدستی سے پدرانہ شفقت کے مضبوط ہاتھوں سے نہایت صفائی کے ساتھ ہتھیا لی۔ (یہ بات برائے تفننِ طبع اور جملہ معترضہ کے طور پر لکھ دی ہے حقیقت تمام اہلِ قلم حضرات جانتے ہیں) بہر حال یہ جناب احمد ندیم قاسمی کی محبت کی عظمتوں کی مثالیں ہیں۔ بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں!!!

یہ مثالیں کسی عظیم انسان! کسی عظیم شاعر!! کسی عظیم افسانہ نگار!!! اور کسی عظیم دیباچہ نگار!!!! ہی کی ہو سکتی ہیں۔

لیجئے مَیں کدھر نکل گیا باتیں مَیں ''ترکش'' کے دیباچے کی کر رہا تھا اور کتھا منہ بولے عظیم رستے کی عظمتوں کی بیان کر دی۔ مَیں کون ہوتا ہوں یوں ان کے نجی معاملات میں بے جا دخل اندازی کرنے والا۔

چلئے قارئین جہاں سے ربط ٹوٹا تھا وہیں سے پھر بات شروع کرتے ہیں۔ ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ نہ تو مَیں کوئی بیوروکریٹ ہوں نہ مَیں کوئی لڑکی جو منہ بولی بیٹی یا شاگرد بن سکتا۔ ویسے دیباچہ لکھوانے کے لیے صرف لڑکی ہونا بھی کافی تھا۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان کتابوں اور شاعرات کا نام لینا کوئی ضروری نہیں سب لکھنے والے لوگ ان کتابوں کو یقیناً جانتے ہوں گے۔۔۔ نہ مَیں کوئی لڑکی ہوں نہ مَیں ٹیلی ویژن کا پروڈیوسر۔ (جسے میرے تعارف کرانے پر اپنی کتابوں کا پورا سیٹ تحفے میں پیش کر دیا جائے)۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں آپ کو یقین نہیں آتا کہ اتنی بڑی شخصیت یہ کام بھی کر سکتی ہے۔ تو لیجئے' یہ واقعہ بھی سن لیجئے۔

یہ واقعہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ان بڑی بڑی شخصیات کے کردار کے چھوٹے پہلو بھی ان کے چاہنے والوں کو معلوم ہوسکیں۔

میرے دوستوں میں میرا بڑا پیارا دوست نذیر عامر پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد پر پروڈیوسر ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ میرا تعارف احمد ندیم قاسمی صاحب سے تو کرادو۔۔۔مَیں نے کہا چلو یہ کونسی بات ہے۔۔۔ چنانچہ ہم لاہور چلے گئے اور ''فنون'' کے دفتر پہنچے جوان دنوں سکریٹریٹ کے پاس واقع تھا۔

مَیں نے کہا: ''قاسمی صاحب یہ میرا دوست نذیر عامر ہے جو آپ سے ملنے کا بہت مشتاق ہے۔ قاسمی صاحب نے بڑے رسمی سے Smile کے ساتھ نذیر عامر کے ساتھ ہاتھ ملایا' پھر مَیں نے بتایا کہ یہ اسلام آباد ٹی وی سٹیشن پر پروڈیوسر ہے اور ادبی پروگرامز کرتا ہے۔ تو قاسمی صاحب کی رسمی مسکراہٹ بہت معنی خیز شفقت میں تبدیل ہوگئی اور پھر دونوں کے درمیان گفتگو شروع ہوگئی اور مَیں نظر انداز ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد چائے وائے پی کر ہم لوگ واپس اسلام آباد آ گئے یا شاید مجھے لاہور ٹی وی پر کوئی مشاعرہ پڑھنا تھا وہ پڑھا جو نذیر عامر نے اس تعارف کے بدلے میں مجھے پڑھوایا تھا۔ بہر حال جب ہم اسلام آباد پہنچے تو ایک ہفتے بعد نذیر عامر نے بتایا کہ جناب احمد ندیم قاسمی نے اسلم کمال کے ہاتھوں اس کے لیے اپنی تمام کتابوں کا سیٹ تحفے کے طور پر بھجوایا ہے' مجھے حیرت بھی آئی اور حسد بھی بہت ہوا۔ اس لیے کہ میرے تعلقات جناب احمد ندیم قاسمی سے کوئی تین سال سے چلے آ رہے ہیں اور مَیں شاعر بھی ہوں لیکن مجھے آج تک انہوں نے ایک کتاب بھی عطا نہیں فرمائی اور نذیر عامر جو نہ شاعر ہے نہ ادیب اور جس کا تعارف بھی مَیں نے ان سے کروایا ہے اور اس تعارف کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود صرف اس لیے کہ وہ ٹی وی کا پروڈیوسر ہے اور ادبی پروگرام کرتا ہے اسے ملک کا سب سے نامور شاعر' ادیب' کالمسٹ اور دیباچہ نگار اپنی تمام کتابیں تحفے میں پیش کر رہا ہے' مجھے جناب احمد ندیم قاسمی سے اپنے تعلق کے سلسلے میں بہت ندامت سی ہوئی۔ اپنی اوقات کا پتہ چلا اور نذیر عامر کے پروڈیوسر ہونے کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔۔۔ اس دن سے مَیں نے بھی نذیر عامر کی عزت شروع کر دی اور سوچا کہ میں شاعر کیوں ہوا پروڈیوسر کیوں نہ ہوا۔ چلیں چھوڑیں مَیں کہہ رہا تھا۔۔۔ کہ نہ تو مَیں ٹی وی کا پروڈیوسر ہوں نہ میں ''فنون'' کو اشتہار اکٹھے کر کے دے سکتا ہوں نہ مَیں ان کی منہ بولی کا جھوٹا مداح نہ اس کا کوئی Favourite ہوں نہ ہی ندیم صاحب کو مجھ سے کوئی مالی منفعت ہوسکتی ہے' جب مَیں یہ سب کچھ نہیں ہوں تو پھر میری کتاب کا دیباچہ کیسے لکھا جا سکتا ہے۔ ہاں البتہ میں متذکرہ بالا شعبوں میں سے کسی ایک شعبے سے بھی تعلق رکھتا چاہے خوبصورت لڑکی نہ سہی موٹی سی لڑکی ہوتا۔ چاہے من بھاتی نہ سہی من سورہ قسم کی لڑکی ہوتا' چاہے میری نیلی ٹھوڑی میری روز شیو کرنے کی چغلی کھا رہی ہوتی' چاہے میں ایسی لڑکی ہوتا جس کی مسیں بھیگی ہوئی ہوتیں اور جو روز اپنی فرنچ کٹ داڑھی منڈوا کر جناب ندیم قاسمی کے شانہ بشانہ چلنے کے اہل ہوتی۔۔۔ جو اپنا گھر آباد کرنے کی بجائے احمد ندیم قاسمی صاحب کا دفتر آباد رکھتی۔ دوپہر کا کھانا دفتر میں کھلاتی اور کھانے کے بعد دفتر ہی میں انھیں قیلولہ کرواتی۔ ہر آنے جانے والے کو داڑھی منڈا Smile دے کر ''فنون'' کے لیے چندہ اکٹھا کرتی اپنے ادارے کے لیے لاکھوں روپے وصول کر کے شام اور مراسم جیسی

کتابیں ندیم صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر چھاپتی۔

تو میری کتاب کا دیباچہ تو کیا مجھے نظموں کی پوری کتاب لکھ کر دی جاسکتی تھی، مجھے شہر شہر میں دوستوں اور مداحوں کی نجی محفلوں میں Promote کیا جاسکتا تھا۔ پورا ''فنون'' میری مداحی میں بھرا جاسکتا تھا اور میری کتاب کا درجہ آسمانی کتاب کے بعد زمینی کتابوں میں سب سے اُونچا شمار کیا جاتا۔ میرا بھی ہر شعر ''نشتر'' ہوتا، مگر ایسا نہیں ہوا میں ان کا منہ بولا رشتہ دار نہیں صرف اور صرف عدیم ہاشمی تھا۔ اس لیے میرا دیباچہ کیسے لکھا جاسکتا تھا۔

بڑے دُکھ کی بات ہے کہ ایسی عمر میں جب شاعر اور ادیب بزرگ ہوجاتے ہیں تو ان کی عزت کئی گنا بڑھ جاتی ہے لیکن جناب احمد ندیم قاسمی اس عمر میں صرف ایک منہ بولی کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے دنیا کی کسی قسم کی نظروں کی کوئی پروانہیں کررہے ہیں۔ حتیٰ کہ یوں بھی ہوا کہ دفتر ''فنون'' میں پہلی منہ بولی بیٹی پروین شاکر کو دوسری منہ بولی بیٹی کے لیے دفتر سے نکال دیا گیا۔ جی ہاں سُنا ہے گالیاں دے کر نکال دیا گیا۔ ایسے گواہ موجود ہیں لیکن ان کے نام زیادہ ضروری نہیں ہیں۔۔۔ایک منہ سے بنایا ہوا رشتہ تھا۔ سومنہ سے توڑ دیا گیا۔۔۔کاش اختر حسین جعفری زندہ ہوتے تو بتاتے کہ انھیں اس واقعے کا کتنا دُکھ ہوا تھا۔۔۔شہر کے تمام رائٹرز ہار گئے اور ایک منہ بولی بیٹی جیت گئی۔

بزرگی میں انسان کمزور تو ہوجاتا ہے لیکن ایسی بھی کیا کمزوری کہ انسان ایک قدم بھی منہ بولے رشتے کے سہارے کے بغیر نہ چل سکے۔ جب کہ اپنے اصلی اور سچے رشتے بھی موجود ہوں۔ یہ بھی کیا کمزوری کہ ''فنون'' کے ستونوں جیسے کارکن جن کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ خالد احمد، نجیب احمد، عارف محمود اور بہت سے دوسرے ساتھی صرف ایک تعلق پر قربان کر دیئے جائیں۔

اس تعلق پر اپنی فیملی حیرت زدہ ہوتی ہے تو ہو۔ سارا شہر حیرانی میں ڈوبتا ہے تو ڈوبے۔ اپنی شہرت کو لاج لگتی ہے تو لگے۔ بس آنکھوں پر منہ بولے تعلق کی پٹی برقرار رہے باقی سارا جہان اس پٹی کے پیچھے چھپتا ہے تو چھپے۔۔۔''فنون'' کا معیار اور اپنا کردار زمانے کی نگاہوں میں مشکوک ہوتا ہے تو ہو۔ یہاں کونسی سانچ کو آنچ ہے۔ تعلق ہے تو ہے۔ (خاکم بہ دہن) کوئی ناجائز تو نہیں۔ دنیا جو کہتی ہے کہے۔ دنیا کا کیا ہے دنیا تو ہمیشہ کہتی ہی آئی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایسی محبت انسانی طاقت نہیں آسمانی طاقت کے سہارے ہی پروان چڑھائی جاسکتی ہے۔ لیجئے میں پھر کہیں اور نکل گیا حالانکہ میں ''ترکش'' کے اس دیباچے کا رونا رو رہا تھا جو نہیں لکھا گیا۔ اب دیکھئے کہ ایسی صورتِ حال میں جب ''فنون'' کے ستون جیسے ساتھی ایک تعلق پر قربان کردیئے گئے ہوں ساری دنیا کو بھاڑ میں پھینک دیا گیا ہو تو مجھ ناچیز اور ایک ایسے پردیسی شاعر کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور پھر ایسی صورت میں جبکہ مَیں ان کی مالی ڈیمانڈ بھی پوری نہ کرپایا ہوں میری کتاب کا دیباچہ کیسے لکھا جاسکتا تھا۔

یہ سوچ کر مَیں نے صبر شکر کرلیا اور اپنی نیازمندی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا پھر جب میری کتاب ''ترکش'' چھپ گئی تو مَیں نے اس کی رونمائی کی تقریب کی صدارت کے لیے جو شہر سے باہر ہونا تھی جناب احمد ندیم قاسمی سے درخواست کی۔ تو توقع کے مطابق درخواست بغیر کسی تامل کے ٹھکرا دی گئی۔ چنانچہ یہ فریضہ میرے محترم دوست جناب قتیل شفائی صاحب نے

سرانجام دے کر مجھے اعزاز بخشا۔ جناب شہزاد احمد نے بھی بڑی محبت سے اس تقریب میں شرکت کی اور امجد اسلام امجد بھی اس وقت تک مجھے ندیم صاحب کا چہیتا سمجھتے ہوئے میرے تقریب میں گوجرانوالہ اپنی گاڑی میں پہنچ گیا۔ اسے یہ بعد میں معلوم ہوا کہ جناب احمد ندیم قاسمی نے میری تقریب کی صدارت سے انکار کر دیا ہے۔ چلئے یہ بھی کوئی ایسی بات نہ تھی کہ میری نیاز مندی میں فرق آ جاتا' پھر جب میری دوسری کتاب ''مکالمہ'' شائع ہوئی تو یہ ایک منفرد اور تجرباتی کتاب تھی جس میں مَیں نے ''مکالماتی غزلوں'' کا تجربہ کیا تھا۔ مَیں نے یہ مکالماتی غزلیں لکھیں تو حسبِ معمول جناب احمد ندیم قاسمی کی خدمت میں ''فنون'' کے لیے برائے اشاعت پیش کر دیں' جوانھوں نے جلیل عالی کے گھر میں اپنی منہ بولی کی موجودگی میں اپنے بیگ میں یہ کہہ کر رکھ لیں کہ یہ ''فنون'' کی اشاعت میں شامل ہو جائیں گی۔ شاید کچھ دیر کے لیے وہ بھول گئے تھے کہ اب ان کا میرے ساتھ وہ تعلق نہیں ہے لیکن بعد میں انھیں یقیناً خیال آ گیا ہوگا یا ان کی منہ بولی نے یاد دلا دیا ہوگا۔ چنانچہ میری کتاب چھپ گئی لیکن میری غزلیں ''فنون'' میں نہ چھپ سکیں' جب کہ اس دوران ''فنون'' کے دو تین شمارے بھی چھپ کر آ گئے اور قارئین کو پتہ ہے کہ ''فنون'' کے دو شمارے کتنی دیر میں چھپتے ہیں۔ بہرحال میری نیاز مندی میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ حالانکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نئی قسم کی غزلیں ہیں۔ ان کا ''فنون'' میں چھپنا اس لیے بھی مسئلہ ہے کہ لوگوں تک نیا ڈکشن اور نیا اسلوبِ سخن پہنچ نہ جائے۔ پرانے مدیر یہ کر لیا کرتے تھے کہ اگر کسی شاعر کی نئی غزل یا نئی نظم چھپنے کے لیے آتی تھی تو وہ اسے روک کر پہلے اس سٹائل میں اپنی غزل یا نظم لکھ کر چھاپ دیتے تھے اور بعد میں اس بیچارے شاعر کی غزل یا نظم چھپتی تھی جو اصل میں اس اسلوب یا سٹائل یا نئے پن کو Originate کرتا تھا۔ یہاں یہ مسئلہ تھا کہ ''مکالماتی غزل'' خود تو کہی نہیں جا سکتی تھی کیوں کہ مَیں اسے بہرحال مختلف حلقوں میں Introduce کروا چکا تھا۔ یہاں صرف یہ تھا کہیں میرا نام اس نئے پن کے ساتھ ''فنون'' کے دائرہ اشاعت تک نہ پہنچ جائے۔ یہ نیا پن جتنا دب سکتا ہے دبے۔ بہرحال میری نیاز مندی برقرار رہی اور کتاب ''مکالمہ'' چھپنے کے بعد میں نے کتاب کی تقریبِ رونمائی کے سلسلے میں اپنے پبلشر سے یہ کہا کہ وہ صدارت جناب احمد ندیم قاسمی سے کروائے اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کہا کہ قاسمی صاحب مان گئے ہیں۔

پھر ''مکالمہ'' کی تقریبِ رونمائی جس طرح ہوئی یہ بھی ایک قابلِ بیان واقعہ ہے لیکن اس کا یہ محل نہیں۔۔۔صدارت بہرحال جناب احمد ندیم قاسمی نے کی اور ''مکالمہ'' کی ایسی کمال کی مخالفت کی ایسی بخیے اُدھیڑے کہ سبحان اللہؐ۔۔۔شدید مخالفت کرنے کے بعد ڈائس پر سے اُتر کر میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ ''آپ خفا تو نہیں ہیں'' میں دل کا مریض صرف یہ سوچتا رہا کہ میرا قصور کیا ہے۔ یہ کوئی تنقیدی اجلاس تو نہیں کتاب کی Promotion کی تقریب ہے اور جناب احمد ندیم قاسمی نے تیس سالہ محبت کا پہلی بار میری تقریب پر تحریری انداز میں یہ تحفہ عنایت کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ میں ان کا کتنا پُرانا نیاز مند ہوں اور یہ زندگی میں پہلا موقع ہے کہ جناب احمد ندیم قاسمی میری شاعری کے بارے میں کوئی اظہارِ خیال Publically کر رہے ہیں۔ اس شدید مخالفت سے میرا کیا حال ہوگا میرے فنکشن کا کیا بنے گا۔ پھر میں دل کا مریض ہوں مجھے پہلے بھی ہارٹ اٹیکس ہو چکے ہیں کہیں ایسا نہ ہو اس شدید مخالفت سے عدیم ہاشمی کو کوئی ہارٹ اٹیک ہو جائے۔ ہارٹ اٹیک

کیا میرا ہارٹ فیل بھی ہوسکتا تھا۔ مَیں اسی فنکشن میں اس صورتِ حال کی تاب نہ لا کر مر بھی سکتا تھا۔ اس لیے کہ ان سے میری تو عقیدت اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے پاس میرے خطوط موجود تھے۔ 1968ء سے لے کر 1979ء تک 11 سال دفتر ''فنون'' میں میری ہر روز کی حاضری میری عقیدت کی گواہ ہے۔ یعنی میں جس نے اپنا تخلص عدیم رکھا ہی ''ندیم'' کی وجہ سے تھا۔ اس عدیم ہاشمی کی کتاب کی ندیم قاسمی لاہور کے تمام رائٹرز کی موجودگی میں دھجیاں اُڑادے اور وہ عدیم ہاشمی دل کا مریض ہوتے ہوئے بھی زندہ رہے تو یہ اس کا حوصلہ ہے اور جناب احمد ندیم قاسمی کی ''انسان دوستی'' کی داد دینی پڑتی ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ انسان دوستی کی شاعری ایسی ہی محبتوں کی بنا پر کرتے رہے ہیں۔۔۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے میری کتاب ''مکالمہ'' کی میرے فنکشن میں شدید مخالفت کیوں کی مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر انھیں مخالفت ہی کرنا مقصود تھی تو مجھے دفتر میں بلا کر کہہ دیتے کہ تم اپنی کتاب کی صدارت مجھ سے مت کرواؤ۔ کیونکہ میں تمہاری ''مکالماتی غزلوں'' کو غزلیں نہیں مانتا۔۔۔ یہ سب بکواس ہے۔۔۔ اس لیے بہتر ہے مجھ سے اپنی ''مکالمہ'' کی شاعری پر کچھ مت کہلواؤ۔ یا پھر اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔ مَیں اس طرح ان کی رائے کی زیادہ عزت کرتا اور ان کے ساتھ اپنے تعلق کو قابلِ فخر سمجھتا اور محسوس کرتا کہ وہ میرے دوست ہیں۔۔۔ اور سچے دوست ہیں انھیں ان کی مالی ڈیمانڈ پوری نہ ہونے کا کوئی ملال حقیقت میں نہیں ہے اور میرے معاملے میں وہ اپنی منہ بولی کے بہکاوے میں بھی نہیں آئے ہیں اور ان کا خیال میری شاعری کے بارے میں بغیر کسی تعصب اور بغیر کسی جانبداری کے ہے۔۔۔ پھر مَیں ان کو اپنی کتاب کی تقریب کی صدارت کے لیے تکلیف دیتا تو مجھے پہلے سے ان کی رائے کا علم ہوتا اور مَیں اس صورتِ حال کے لیے تیار ہوتا۔۔۔ اور مَیں یقیناً اپنی کتاب کی صدارت ایسی صورتِ حال میں بھی انہی سے کرواتا۔۔۔ ان کی مخالفت بھی اس صورت میں بہر حال میرے لیے اعزاز کا باعث ہی ہوتی۔۔۔ ان کی غیر جانبدارانہ بلاتعصب اور مدلل مخالفت سے مجھے اپنے تجربے کی بلندی کا احساس ہوتا۔۔۔ اس شب خون سے' ان کی غیر مدلل جانبدار اور متعصب مخالفت سے ان کی انسان دوستی ان کی غیر ناقدانہ تنقید اور ان کی شخصیت کا قد آور بُت ''مکالمہ'' کے قدموں میں آ گرا۔۔۔ اب اس کے ریزے اتنے بکھر چکے ہیں کہ یکجا نہیں ہو سکتے اور اگر کسی صورت میں جھاڑ و واڑ و دے کر اکٹھے کر بھی لیے جائیں تو جڑ نہیں سکتے اور اگر کسی گلو یا ایرل ڈائٹ وغیرہ سے یہ ریزے جوڑ بھی لیے جائیں تو ان کا بت نہیں بن سکتا۔۔۔ اور فرض کیجیے اگر کوئی کاری گر یہ بُت اِن جڑے ہوئے ٹکڑوں سے بنا بھی دے تو اتنے ریزوں کے جوڑ معدوم نہیں ہوسکیں گے اور وہ پشاور کے چائے خانوں کی اس چائے دانی کی طرح نظر آئے گا جو ان چائے خانے والوں نے سوا ڈیڑھ سو ٹانکے لگا کر جوڑی ہوئی ہوتی ہے۔۔۔ اس شکستگی کا انھیں کوئی دُکھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مجھے اس بُت کے ٹوٹنے کا اپنی باقی تمام عمر تک افسوس رہے گا جو بُت مَیں نے جناب احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کا اپنے اندر کے سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر تراشا تھا۔

منہ بولے رشتے نبھانا اور بات ہے۔ انسان دوستی کی شاعری کرنا اور بات ہے اور انسان سے دوستی کرنا بالکل ایک الگ فعل ہے۔۔۔ یہ وہ نتیجہ تھا جو مَیں نے لاہور میں اپنی کتاب ''مکالمہ'' کی تقریب سے اخذ کیا۔

اگلے روز میری کتاب کی تقریب اسلام آباد میں تھی اور اس سے اگلے روز مجھے امریکہ روانہ ہو جانا تھا۔ مَیں ان کے

ڈائیلاگ ''آپ خفا تو نہیں ہیں'' بلکہ یہ مکالمہ سرگودھا کے پنجابی لہجے ہی میں کہا گیا تھا۔ ''تسیں خفا تے نئیں او'' اس مکالمے کے جواب میں مَیں صرف مسکرا دیا۔۔۔اور امریکہ پہنچ کر ٹھیک ایک مہینے کے بعد میں دل کے اس دورے کا شکار ہوا جس نے مجھے اگلے جہاں کی سیر تو نہیں کرائی لیکن اگلے جہان کی ایک جھلک ضرور دِکھلا دی۔۔۔شکر ہے میں امریکہ میں تھا ورنہ اس شدید دورے کا راولپنڈی میں کیا علاج ہوتا۔ یہ تحفہ چونکہ جناب احمد ندیم قاسمی کی طرف سے تھا اس لیے مجھے اچھا لگا اس لیے اس کے باوجود میری نیاز مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مَیں پاکستان پہنچا اور مَیں نے اپنی تیسری کتاب ''چہرہ تمہارا یاد رہتا ہے'' کی تیاری شروع کر دی اور پھر اتفاق یہ کہ جلیل عالی کے گھر میں میری پھر ملاقات جناب احمد ندیم قاسمی اور ان کی منہ بولی کے ساتھ ایک نجی نشست میں ہوگئی۔ مَیں بیماری کے عالم میں بھی وہاں پہنچ گیا۔۔۔اور جب سب احباب نے اپنا کلام سُنا یا تو مَیں نے بھی اپنی نئی تجربات غزلیں جو مَیں نے تضاداتی غزل کی صورت میں لکھی ہیں۔۔۔پیش کیں۔۔۔میرے محسن اور انسان دوست شاعر دانشور افسانہ نگار اور ملک کے سب سے بڑے دیباچہ نگار نے میری غزلوں کا سب کی موجودگی میں مذاق اُڑایا۔۔۔(حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے) اور کہا۔۔۔

''عدیم صاحب آپ کی غزلیں سن کر مجھے سیّد یاسین قدرت یاد آ گیا ہے' جس نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ لیا تھا اور کہا تھا کہ میری غزلیں ''فنون'' میں چھاپیں ورنہ میں خودکشی کر لوں گا'' اس کے بعد مجھ سے یہ تضحیک اور یہ توہین برداشت نہیں ہوئی پھر میں ان کے حلقہ نیاز مندی سے نکل گیا اور پھر بہت سے لوگ جو مجھے چلتے پھرتے عبادت خانوں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ شراب خانوں کی طرح گندے اور ناپاک دکھائی دینے لگے۔ یہ بھی جناب احمد ندیم قاسمی کی عطا ہے کہ مجھے لوگوں کے اندر جھانکنے کا ڈھنگ سکھا دیا ورنہ تو میری آنکھوں پر ہمیشہ عقیدت کی پٹی بندھی رہتی اور پھر مَیں نے سوچا کہ اب میری عمر ایسی نہیں کہ مَیں کسی کی نیاز مندی میں ہمیشہ سرنگوں رہوں۔ نہ مجھ میں پیغمبرانہ ظرف ہے نہ مَیں نابالغ اور اتنا گیا گزرا ہوں کہ مجھے سَر پر کسی کے دستِ شفقت کی ضرورت ہو۔ اگر مجھ پر میری نیاز مندی کے باوجود اتنا پتھراؤ ہوسکتا ہے تو پتھروں کا انبار میرے پاس بھی موجود ہے۔ بلکہ ہیرے موتی تو دوسرے لکھنے والوں کے پاس ہوں گے میرے پاس تو صرف پتھر ہی پتھر ہیں۔ کوئی مجھ سے موتیوں کے مقابلے میں جیت جائے تو جیت جائے مجھے نہیں لگتا کہ پتھروں کے مقابلے میں مجھ سے کوئی بازی لے جاسکتا ہے۔ کوئی 'ماجھا گاما' شاعر ہو یا کالمسٹ' پتھراؤ کرنے میں میرے سامنے سب کانچ کے پتلے ہیں۔۔۔اس لیے اگر میری کتاب ترکش کا دیباچہ ملک کے سب سے بڑے دیباچہ نگار نے نہیں لکھا تو کیا ہوا اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور اپنے دیباچے خود بھی لکھ سکتا ہوں مگر جب ترکش چھپی تب یہ بات نہ تھی اس لیے میرا مسئلہ صرف ترکش کا دیباچہ اور کوئی بڑا دیباچہ نگار تھا جو میرے نصیب نہ ہو سکا۔ چنانچہ 1992ء میں میری کتاب ''ترکش'' کو بغیر کسی بڑے دیباچہ نگار کے دیباچے کے شائع ہونا پڑا اور حیرت ہے کہ ''ترکش'' کا اس رسالے میں ذکر تک نہیں کیا گیا جس رسالے میں ہرایرے غیرے اور ہرایری غیری کی کتاب پر تبصرے پر تبصرے لکھے جاتے ہیں۔

یہ بات مَیں نے جذباتی ہو کر لکھ دی ہے ذرا سا ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اچھا لگا ہے کہ اس کتاب کا دیباچہ نہیں لکھا

گیا اور الحمدللہ کہ ''فنون'' کے Pets میرا مطلب ''فنون'' کے Pet تبصرہ نگاروں نے اس کتاب پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ورنہ امجد و مجد یا عطا وطا کے ''ترکش'' پر تبصرے سے یہی لگتا تھا کہ جیسے کسی ایم۔اے کی ڈگری کی توثیق ''انگہ'' کے کسی پرائمری سکول کے میٹرک فیل ہیڈ ماسٹر سے کرالی جائے۔

عطا وطا سے یاد آیا کہ میں ایک دفعہ امریکہ سے ناروے گیا تو وہاں بہت سے P''Farms'' دیکھے Farms ''lP''اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ''P'' سے اس جانور کا نام شروع ہوتا ہے جو ہمارے مذہب میں حرام ہے بلکہ جس کا نام لکھنے سے بھی قلم ناپاک ہو جاتا ہے بلکہ وہ جانور ہر جگہ گالی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے' جو قوم اسے کھاتی ہے وہ بھی گالی کے لیے اسی کا نام استعمال کرتی ہے۔

یہ جانور ناروے میں بہت صحت مند دکھائی دیئے۔ سفید چمڑی' بڑا سا منہ' فربہ گردن' گردن میں تناؤ' بڑے بڑے نتھنے' نتھنوں میں پھلاؤ۔۔۔

سفید پھر میں پاکستان آیا تو مَیں نے عطا کو دیکھا تو مجھے فوراً وہ جانور یاد آ گیا۔ وہی صحت' چمڑی' بڑا سا منہ' فربہ گردن' گردن میں تناؤ' بڑے بڑے نتھنے' نتھنوں میں پھلاؤ۔ بس پھر مَیں نے عطا کا بھی پورا نام لینا چھوڑ دیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میں مخفف کر کے P''Farm'' لکھتا ہوں۔

ارے لاحول ولاقوۃ یہ عطا وطا اور P''Farms'' کہاں سے یاد آ گئے مَیں تو ذکر ترکش کے دیباچے کا کر رہا تھا۔ اور اسے ہی شاید (Free Association of Thoughts) کہتے ہیں۔ بہر حال۔

اب میں تین عدد کتابوں کا مصنف ہوں اور دو عدد کتابیں طباعت کے مرحلے میں بھی ہیں۔ اس لیے اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اپنی کتاب کا دیباچہ خود بھی لکھا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ملک کے سب سے بڑے دیباچے نگار سے لکھوایا جائے۔ بلکہ میری تیسری کتاب ''چہرہ تمہارا یاد رہتا ہے'' کے دیباچے سے تو یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ اگر کتاب کا دیباچہ خود لکھا جائے تو دیباچے کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں ملک بھر میں تقسیم ہوتی ہیں اور کہیں کہیں تو فروخت بھی ہوتی ہیں۔ کتاب کسی کے پاس پہنچے نا پہنچے دیباچہ ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے اپنے لکھے ہوئے دیباچے کے ساتھ ''ترکش'' کا تازہ ایڈیشن حاضر ہے۔ (ویسے اس کتاب کے دیباچے کی فوٹوسٹیٹ کاپیوں کے ایڈیشن کی مجھے الگ طور پر چھپنے سے پہلے ہی آفر ہو چکی ہے) یہ صرف اپنے لکھے ہوئے دیباچے کا جادو ہوتا ہے جو سَر چڑھنے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیتا ہے۔۔۔ والسلام

☆☆☆

فیض کی شاعری میں سماجی شعور کا ارتقاء

ڈاکٹر محمد امین

فیض نے اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھا لیکن علامتوں کو نیا مفہوم دیا اور نئے تناظر میں نئی تراکیب وضع کیں۔فیض کی شاعری میں نقش فریادی سے لے کر مرے دل مرے مسافر تک کے سفر میں فیض کے سماجی شعور میں ارتقا نظر آتا ہے۔فیض کا سماجی شعور انفرادی احساس سے طبقاتی شعور تک' طبقاتی شعور سے وطن کی محبت تک اور وطن کی محبت سے ایک انسان دوست عادل عالمی معاشرے پر منتج ہوتا ہے۔

سماجی شعور کی اصطلاح بھی کلیشے لگتی ہے لیکن فیض کے یہاں اس کا معتبر مفہوم ہے جو فیض کی زندگی سے ہم آہنگ ہے۔سماجی شعور سے میری مراد حال کے معاشرتی حالات و واقعات کا ماضی کے تناظر میں ایسا منطقی تجزیہ ہے جو مستقبل کی تبدیلی کا محرک بنے جس سے بہتر معاشرہ وجود میں آسکے۔سماجی شعور کا مرکز مستقبل کی تبدیلی ہے۔شاعرلوگ کے عنوان سے مرے دل مرے مسافر سے ایک اقتباس دیکھئے۔یہ نظم قفقاز کے شاعر قاسن قل سے ماخوذ ہے' لیکن فیض کے نظریۂ شاعری کی ترجمانی کرتی ہے۔

ہم نے ان پر کیا حرفِ حق سنگ زن
جن کی ہیبت سے دنیا لرزتی رہی
جن پر آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا
اپنی آنکھ ان کے غم میں برستی رہی
دکھ بھری خلق کا دکھ بھرا دل ہیں ہم
طبعِ شاعر ہے جنگاہِ عدل و ستم
منصف خیر و شر' حق و باطل ہیں ہم

اس اقتباس میں فیض نے مظلوم لوگوں سے وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کو خیر وشر اور حق و باطل کا منصف قرار دیا ہے۔فیض کے نزدیک یہی شاعر کا منصب ہے۔

فیض کے سماجی شعور کی ابتدائی شکل ان کے پہلے مجموعے ''نقش فریادی'' کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''، میں نظر آتی ہے۔فیض کا یہ احساس کہ زمانے میں محبت کے علاوہ اور بھی دکھ ہیں اور محبوب کا پہلی سی محبت کا تقاضا کیا معنی رکھتا ہے جب کہ مظلوم اور دکھی لوگوں کی طرف بھی نظر لوٹ جاتی ہے۔معاشرے میں موجود دکھی اور مظلوم انسانوں کے دکھوں کی آگاہی سے پیدا ہوتا ہے۔یوں یہ انفرادی احساس طبقاتی شعور میں ڈھل جاتا ہے۔

ان گنت صدیوں کے تاریخ بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

شدتِ محبت کا تقاضا کچھ اور ہے۔فیض اس سے منکر نہیں مگر ان کا طبقاتی شعور انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔

یوں ہی گاتا رہوں گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بنتا رہوں' بیٹھا رہوں تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں

دست صبا کی نظم دوعشق ملاحظہ کیجئے جہاں فیض نے محبت اور حبِ وطن کا ذکر کیا ہے۔لیلیٰ اور لیلائے وطن سے محبت کی ہے:

(۱)

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق ، نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

دستِ صبا میں فیض کی محبت وطن کی محبت میں ڈھل جاتی ہے اور وطن اور محبوب کے لیے تشبیہیں ایک ہی ہو جاتی ہیں:

بجھا جو روزن زندان تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
(نثار میں تری گلیوں کے)

یہ سماجی شعور کی دوسری سطح ہے جو وطن میں تبدیلی اور انقلاب کی خواہش مند ہے اور وطن کو محبوب کی طرح حسین دیکھنا چاہتی ہے۔ دستِ صبا میں اس سماجی شعور کی آواز دیکھئے۔

یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں
(شورش بربط و نے۔ دوسری آواز)

زندان نامہ میں اس سماجی شعور کی سطح کچھ اور بلند ہو جاتی ہے۔

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
آ جاؤ ایفریقا
آ جاؤ ببر کی چال
آ جاؤ ایفریقا

یہاں فیض حریت بشر کے لیے مظلوم لوگوں کے ساتھ رشتہ استوار کرتا ہے۔ زندان نامہ سے مرے دل مرے مسافر تک کے سفر میں فیض کا سماجی شعور آفاقی بن جاتا ہے جو ہر مظلوم کی آواز بن کر حریتِ بشر، انصاف اور انسان دوستی پر منتج ہوتا ہے۔ دو نظمیں فلسطین کے لیے پڑھیے۔

دور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں
جس زمین پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطین کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطین برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطین آباد

غبارِایام کی نظم ''ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے'' میں فیض حق کی فتح کے لیے پُر امید ہیں۔

ہم جیتیں گے
حقّا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

مرے دل مرے مسافر کی نظم ''تین آوازیں'' غور طلب ہے۔ پہلی آواز ظالم کی ہے جو کہتا ہے

جشن ہے ماتمِ اُمید کا آؤ لوگو
مرگ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے

دوسری آواز مظلوم کی ہے جو پکارتا ہے:

رات چھائی تو ہر اک درد کے دھارے چھوٹے
صبح پھوٹی تو ہر اک زخم کے ٹانکے ٹوٹے
کیا یہی مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے

تیسری آواز ندائے غیب ہے جو کہتی ہے:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمع سرفروشاں
پڑیں گے دارورسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے

جزا سزا سب یہیں پر ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہو گا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہو گا

ندائے غیب فیض کے سماجی شعور کا پیغام ہے۔فیض کا سماجی شعور اس کے شعورِ ذات سے ہم آہنگ ہے۔فیض کے یہاں انفرادی زندگی کے مراحل سماجی شعور میں ڈھلتے ہیں۔ یہ سماجی شعور محبت سے مربوط ہے۔سماجی شعور کے ساتھ ساتھ فیض کی محبت بھی ارتقا پذیر ہے جو محبوب کی محبت سے شروع ہو کر انسان کی محبت پر منتج ہوتی ہے۔ان کا سماجی شعور بھی محبت کی ہمراہی میں سفر طے کرتا ہے۔فیض نے ظلم سے پاک عادل اور انسان دوست معاشرے کا خواب دیکھا ہے جو اخوت پر مبنی عالمی معاشرہ ہے۔دستِ تہِ سنگ کی نظم سفر نامہ کا پہلا حصہ پیکنگ لائقِ مطالعہ ہے جو فیض کی اس خواہش کا ترجمان ہے۔

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن، دشت و چمن کی حد ہے
میرے سینے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کن فیکون

☆☆☆

مجید امجد کی شعری ہئیتیں

سید عامر سہیل

اُردو شاعری میں ہیئتی تجربات کا باقاعدہ سلسلہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ ان ہیئتی تجربات کے پسِ پردہ محرکات میں یقیناً تخلیق کار کا روایتی اصناف اور ڈھانچے پر عدم اعتماد، موضوعاتی پیش پا افتادگی، ہیئتی جکڑ بندی کے ساتھ ساتھ اُس جدید عہد اور معاشرے کی نئی اشاریت اور حسیت کے ادراک کی شدید خواہش کا بھی عمل دخل تھا جس سے تہذیبی، سماجی، لسانی اور ادبی سطح پر نیا معاشرہ دوچار تھا۔ نئے معاشرے کے تشکیلی دَور میں، دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح، ادب میں بھی مغربی شعور کی اجتماعی برتری نے اُردو زبان و ادب میں تخلیقی امکانات کو نئی وسعتیں دی تھیں۔ نئے فکری و ہیئتی سانچے کی تشکیل، روایت سے بغاوت، نئے لسانی شعور کے مباحث اور اس انداز کے بہت سے سوالات اُردو شعر و ادب میں اُٹھائے جانے لگے تھے۔ اگرچہ یہاں کی خالص جاگیردارانہ سوچ اور نوآبادیاتی نفسیات اس تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی تاہم اُردو کا تخلیقی افق اس تبدیلی سے رفتہ رفتہ روشن ہو رہا تھا۔

نئے معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ اور تعمیر کے اس عبوری دَور میں سر سیّد احمد خان اور اُن کے ساتھیوں نے عقلیت، منطقیت اور استدلالیت کی سطح پر ادب اور دیگر علوم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ حالؔی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں پہلی مرتبہ شعر، تصورِ شعر اور اصلاحِ شعر کے حوالے سے مشرقی اور مغربی انداز کو استعمال کیا۔[1] اگرچہ حالؔی نے انگریزی شاعری اور شعرا سے براہِ راست استفادہ تو نہیں کیا تاہم ان کے ہاں آنے والے عہد میں ممکنہ تجربات کا دھندلا عکس نظر آتا ہے۔ محمد حسین آزاد بھی ہیئتی تجربات کے تشکیلی دَور کے اہم شاہد اور مبصر ہیں۔ انجمن پنجاب کے پہلے اجلاس (۱۵/اگست ۱۸۶۷ء) میں انہوں نے اپنے خطبے ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات'' میں شاعری کی روش پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔[2] لگ بھگ اسی عہد میں بہت سے لکھنے والوں اور مدیران نے روایتی شاعری کے چلن پر اپنے ذہنی تحفظات کا اظہار کیا اور اُس نئے منظرنامے کو واضح کرنے کے جتن کیے جو آگے چل کر نئے ہیئتی تجربات کا دَروا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مولوی محمد اسماعیل کی نظمیں، مولوی عبدالحلیم شؔرر اور ان کا رسالہ ''دلگداز''، علامہ نظم طباطبائی، سر عبدالقادر اور ان کا رسالہ ''مخزن''، اقبال، مولانا تاجور نجیب آبادی اور اُن کا رسالہ ''ادبی دنیا''، عظمت اللہ خان اور اُن کی کتاب ''سریلے بول'' کا مقدمہ اور بعد میں نئے شعراء کا ہیئت کی طرف

رجحان وغیرہ ایک ایسا ادبی اور تاریخی تسلسل ہے جو جدید ہیئتی تجربات کے حوالے سے پس منظر کا کام دیتا نظر آتا ہے۔(۳)

صنف اور ہیئت کے باہمی امتیازات کے حوالے سے بھی سوال قائم کیے گئے۔ بعض اصناف جو صنفی صفت کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص ہیئت رکھتی ہیں اور بعض جو صنفی خصوصیت تو رکھتی ہیں مگر ان کی کوئی متعین ہیئت نہیں ہے اس تناظر میں بعض ناقدین نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے مثلاً شمیم احمد کے مطابق:

> ''اُردو میں اقسام شعر کی شناخت اور درجہ بندی کیلئے کسی منطقی اُصول سے کام نہیں لیا گیا اکثر اصناف وہ ہیں جو اپنی مخصوص اور متعینہ ہیئت کی بنا پر صنف کا درجہ اختیار کر گئیں اور ہیئت ہی ان کی صنفی شناخت کا اہم وسیلہ قرار پائی۔ اس کے برعکس چند اصناف ایسی بھی ہیں جو محض اپنے مخصوص موضوع کی وجہ سے صنف کے درجے پر پہنچیں اور موضوع ہی اُن کی صنفی شناخت کا واحد ذریعہ ہے۔''(۴)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

> ''مختصراً ہم اس نکتے پر اکتفا کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی شعری ہیئت ایک مخصوص طرزِ اظہار ہے جس کی اپنی ایک الگ شناخت' ظاہری شکل ہوتی ہے جو کسی مخصوص نظام کے تحت تشکیل پاتی ہے۔''(۵)

مگر جدید عہد تک آتے آتے صنفی شناخت اور ہیئت کی روایتی بحث خاص پرانی محسوس ہوتی ہے۔ کسی حد تک مغربی شاعری کے اثرات' جدید تحریکوں اور کسی حد تک جدید شعرا کے اجتہادی رویے نے شاعری میں صنف اور ہیئت کی بحث کو ختم کر دیا ہے۔ اُردو میں پرانی اصناف مثلاً قصیدہ' رباعی' مثنوی وغیرہ اپنے مخصوص مزاج کے سبب اب ہمارے شعری مزاج کا حصہ نہیں رہیں بلکہ اب نیا معاشرہ اپنے تخلیقی تجربے کو آزادی اور کھلے پن سے بیان کرتا ہے۔ ہیئتی تجربات کے امکانات کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ ہیئتی تجربات محض ردیف و قافیے' عروضی یا لفظی نشست و برخاست میں تبدیلی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل جمالیاتی تجربہ ہے جسے کسی لگے بندھے اُصول پر پرکھا نہیں جا سکتا۔ ہم اس جمالیاتی تجربے کو محض خارجی خطوط یا سطح تک محدود نہیں کر سکتے۔ ہیئتی تجربات کا ظہور ایک اتفاق نہیں اور نہ ہی کسی منطقی اور طے شدہ فارمولے کے تحت تبدیلی لائی جا سکتی ہے بلکہ یہ خیال کی شدت کا خارجی اظہار ہے۔ خیال اور اس کے اظہار میں نامیاتی ربط اور نمو پذیری ہی کے زیرِ اثر روایتی ہیئتی ڈھانچہ تبدیل ہوتا ہے اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعرانہ ہیئتی تجربات صرف معروضی ترکیب نہیں بلکہ لکھنے والے کا تخلیقی اظہاریہ ہے۔

مجید امجد تک آتے آتے اُردو شاعری ہیئتی تجربات کا اچھا خاصا سفر طے کر چکی تھی اور شعرا اس روشنی اور تبدیلی سے آشنا ہو چکے تھے جو مغربی شاعری کی شکل میں اُردو دان طبقے تک آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک اور بعد ازاں حلقہ اربابِ ذوق نے نظم کو جس شدت سے قبول کیا اور جس رُخ سے دیکھا اس کے باعث بھی نظم جدید ذہن اور تبدیلیوں سے آشنا

ہوتی چلی گئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجید امجد کو نظم میں ہیئتی تجربات کے امکانات کا واضح پس منظر مل چکا تھا' بلا شبہ اُن کے یہاں ان تجربات کا انداز کسی خارجی ماخذ کی بجائے خود ان کے اندر سے ظہور پذیر ہوتا تھا کیونکہ جس دور میں جدید شاعری نئے تجربات سے آشنا ہو رہی تھی اس دور میں خود مجید امجد پرانی اصناف اور روایتی ہیئتوں کو پسند کرتے تھے۔(۲) ان کے یہاں ہیئتی تبدیلی کا باقاعدہ شعور اور اس کا اظہار بہت بعد میں ہوا۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان کے یہاں ہیئت کے حوالے سے ہونے والے تجربات محض تقلید زمانہ کی حد تک محدود نہ تھے' وہ ان تجربات کو تخلیقی جمالیات کی سطح پر لاتے ہیں۔

مجید امجد کا شعری سفر پرانی اصناف اور روایتی ہیئتوں کے استعمال سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی دور میں جو نظمیں لکھی گئیں ان میں مثنوی' ترکیب بند' ترجیع بند' مسدس وغیرہ کی ہیئت کو بڑے شوق سے استعمال کیا گیا ہے خصوصاً مثنوی کی ہیئت ان کے ابتدائی دور کے شعری مزاج کا ایک لازمی حصہ نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے پس منظر میں جھنگ کی فضا کی شعریت' قوافی اور موسیقی سے فطری لگاؤ' مشرقی روایت اور ان کے ذاتی مطالعہ اور رجحان کو خاص اہمیت ہو مگر آگے چل کر انگریزی ادب کے گہرے مطالعہ' تراجم اور نئے شعری افق اور لہجے کو دریافت کرنے کی تخلیقی لگن نے انہیں نئی سمتوں کے سفر اور نئے زاویوں تک رسائی پر اکسایا اور پھر رفتہ رفتہ ان کے یہاں نئے سے نئے کی دریافت اور خوب سے خوب تر کی جستجو کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ ان کے دوسرے اور تیسرے دَور (۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۸ء تک اور ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۷ء تک) میں بالخصوص نئے سے نئے ہیئتی تجربات کا ایک باب دکھائی دیتا ہے' یوں لگتا ہے کہ ہر نظم اپنی ہیئت سمیت ان پر وارد ہوتی ہے۔ مجید امجد نے تقلید کو محض تقلید کی حد تک نہیں رکھا اور نہ ہی یہ ان کا مزاج تھا بلکہ وہ فکری اور فنی سطح پر اجتہادی انداز کو بروئے کار لائے ہیں۔ انہوں نے ہیئتی تجربات کے ضمن میں مغربی شاعری کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی جودتِ طبع سے نیا شعری افق دریافت بھی کیا ہے۔ مجید امجد کی شاعری کے تاریخی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ روایتی موضوعات اور ہیئتی سانچوں سے نکل کر نئے موضوعات اور نئے ہیئتی سانچوں تک پہنچے۔ جہاں انہوں نے روایت سے استفادہ کیا وہاں جزوی تبدیلیاں بھی کیں اور اس سے آگے بڑھ کر نئے سانچے بھی تراشے۔

مجید امجد کے ہیئتی تجربات کو دیکھنے سے پہلے ذرا ملاحظہ کیجئے ان کا وہ فکری اور فنی رجحان کہ مجید امجد ہیئتوں اور نئے سانچوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں وہ ابتدائی دَور کے حوالے سے کہتے ہیں کہ

> ''۔۔۔۔اس زمانے میں مجھے یاد پڑتا ہے فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' اور ''سو رہی ہے گھنے درختوں پر چاندنی کی تھکی ہوئی آواز'' بڑی مقبول تھیں' اسی طرح راشد صاحب اس زمانے میں پابند کہتے تھے:
>
> شگفتہ و شادماں رہے گی
> مری محبت جواں رہے گی
>
> بعد میں جب یہ خود 'ادبی دنیا' کے ایڈیٹر رہے ان کا کلام دیکھا لیکن میں اس وقت

فری ورس(Free Verse) کے اُسلوب کو پسند نہیں کرتا تھا۔''(۷)

پھر بعد میں ہیئتی حوالے سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں وہ مزید کہتے ہیں کہ

''ہیئت سے اس لیے کہ سب سے پہلے تو مروّجہ ہیئت تھی مثلاً مثنوی' مثنوی کی مروّجہ ہیئت میں شعر کہتے وقت خیال ہوتا تھا کہ اس میں انہی پابندیوں کے ساتھ کہہ سکوں تو ٹھیک ہے ورنہ اس میں ایک مصرعے کا دوسرے سے ٹکراؤ ہوجاتا تھا اور مثنوی کا ایک شعر جس میں پہلا مصرعہ دوسرے سے ربط رکھتا ہو' بہت کم ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے سلسلے میں تجسّس سے مجھے آگے رستے ملے مثلاً جب انگریزی شعر کے طرز پڑھے جس میں چار چار لائنوں کا بند ہوتا تھا' میں نے سوچا کہ اس بند کی شکل اسی طرح رہے مگر مضمون رواں رہے چنانچہ میں نے اس زمانے میں کچھ نظمیں اس قسم کی کہیں اور موضوع کے لحاظ سے مختلف ہیئتوں کے تجربے کیے۔''(۸)

ان حوالوں سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مجید امجد کے یہاں نئے تجربات کرنے کا رجحان محض فیشن یا ہم عصروں کی تقلید نہ تھا بلکہ وہ تو اپنے خیال کی شدت کو بیان کرنے کے لیے نئے سے نیا انداز تلاش کرنے کے خواہاں تھے اور یہ تجربات خالصتاً ان کے تخلیقی وفور اور جمالیاتی اظہار کا وسیلہ تھے۔ وہ نظم کی گونا گوں اشکال کے ایک عمر سے سودائی تھے اور لکھنے کی ایک جانکاہ لگن ان کے شعری اظہار کی نمائندہ بنتی نظر آتی ہے۔

مجید امجد کی شاعری کے موضوعات کا سرسری جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ فلسفیانہ افکار' نئی تہذیبی صورتِ حال' انسان کا المیہ' نئے صوفیانہ تجربے کا انکشاف' سائنسی اور کائناتی شعور غرض اس انداز کے بہت سے ایسے موضوعات ہیں جن کا ادراک اور پھر اظہار روایتی سانچوں اور ہیئت میں کرنا ممکن نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر نوازش علی:

''اس کی تقریباً ہر نظم صرف خارجی شکل وصورت کی حد تک ہی نہیں بلکہ اپنے اندرونی عمل کے اعتبار سے ہر پہلی نظم کے مقابلے میں ایک نیا تجربہ ہے لیکن اس کے تجربے نامکمل اور خام نہیں ہوتے کیونکہ اس کی شاعری محض ہیئت کے تجربات ہی سے مرکب نہیں ہے بلکہ اس میں مواد' آہنگ اور ہیئت ایک وحدت میں ڈھل کر مکمل اظہار کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کے یہاں ہیئت محض ذریعہ اظہار نہیں بلکہ طریقِ فکر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔''(۹)

مجید امجد کے یہاں ہیئتی تجربات کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کی شاعری کا آغاز روایتی ہیئتوں کے استعمال سے ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ خیال کی شدت اور فکری وفور کے سبب روایتی ہیئتوں کی پابندیوں اور

حدود سے اکتا کر اورانہیں ناکافی سمجھتے ہوئے نئے تجربات کی طرف مائل ہوتے ہیں ان کی شاعری میں ان تجربات کو چار ادوار میں دیکھا جا سکتا ہے (ان ادوار کا ذکر گزشتہ ابواب میں آچکا ہے)

i۔ پہلا دور ــــ آغاز سے ۱۹۴۰ء تک

ii۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۸ء تک

iii۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۷ء تک

iv۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء تک

ان ادوار میں انہوں نے اپنے شعری میلان، تخلیقی اُپج، ذاتی تجربات، داخلی واردات اور وسعتِ مطالعہ سے نظم کے نئے پیرائیوں کو نئے اُسلوب اور ہیئتی پیمانوں سے دیکھا ہے۔ حسرتِ اظہار کا یہی احساس انہیں نئے اُفق سے روشناس کرتا ہے۔ پہلے دور میں ان کا سفر روایتی اُسلوب، موضوعات اور ہیئتوں سے مرتب ہوتا ہے۔ اس دور میں وہ اپنے کلاسیکی ورثے اور مزاج سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اگرچہ کہیں کہیں نئے ہیئتی پیمانے اپنی چھب دکھاتے ہیں تاہم غالب انداز روایتی ہی رہتا ہے۔ دوسرے دَور میں ان کے یہاں روایتی ہیئتوں میں جزوی تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں اور وہ تیزی سے ایک نئے منظرنامے کو بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرا عہد ہیئتی تجربات کے حوالے سے سب سے زیادہ زرخیز دَور ہے۔ اس دَور میں وہ ایک نظم کے ہیئتی تجربے کو دہراتے نظر نہیں آتے، تجربات کا تنوع سب سے زیادہ اسی دور میں ملتا ہے جب کہ آخری دور میں ان کا غالب رجحان آزاد نظم کے مزاج میں ڈھل جاتا ہے۔ اگر بحیثیت مجموعی ان ادوار کا تجزیہ کیا جائے اور ان کے یہاں ہیئتی تبدیلیوں کی درجہ بندی کی جائے تو وہ کچھ یوں ہوگی:

i۔ اُردو شاعری کی روایتی ہیئتوں کا استعمال

ii۔ روایتی ہیئتوں میں جزوی تبدیلیاں

iii۔ انگریزی شعری ہیئتوں سے استفادہ اور جزوی تبدیلیاں

iv۔ دو یا دو سے زیادہ ہیئتوں کا انضمام

v۔ نئی ہیئتوں کی اختراع

vi۔ آزاد نظم کا رجحان

اس تقسیم کو مدنظر رکھا جائے تو صورتِ حال یوں نمایاں ہوتی ہے۔ روایتی ہیئتوں میں انہوں نے غزل کو اپنے تجربے کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے کلیات میں اکسٹھ غزلیں شامل ہیں۔[10] بعض نظمیں غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ''جوانی کی کہانی'' (ص ۶۱ -کلیاتِ مجید امجد مرتبہ خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۹ء) ''بیساکھ'' (ص ۸۵) ''سازِ فقیرانہ'' (ص ۱۱۱) ''حسینؑ'' (ص ۱۳۵) ''واماندہ'' (ص ۱۶۹) ''ایک دعا'' (ص ۱۸۷) ''افتاد'' (ص ۲۳۵) اور ''حضرت زینبؓ'' (۴۴۷)۔ غزل کی ہیئت میں لکھی گئی چند نظمیں ایسی ہیں جو رسائل یا دیگر انتخاب میں بطور غزل شامل کی گئی ہیں مگر کلیاتِ مجید امجد میں اسے نظم کے

طور پر شامل کیا گیا ہے مثلاً نظم ''کوئٹے تک'' (ص۳۱۵) کا دوسرا حصہ:

برس گیا بہ خراباتِ آرزو ترا غم
قدح قدح تری یادیں سبو سبو ترا غم

''مرے خدا مرے دل'' (ص۹۹ مرتبہ تاج سعید، ۱۹۷۵ء) میں بطور غزل درج ہے۔[11] کلیات میں شامل نظم ''بول انمول'' (ص۳۶۷) ''گلاب کے پھول'' (ص۱۵۹، مرتبہ حیات سیال، ۱۹۷۸ء) اور دیگر کتب میں بطور غزل شامل ہے۔ اسی طرح نظم ''جہاں نورد'' (ص۴۴۳) اور ''کون دیکھے گا'' (ص۴۴۵) بھی مجید امجد کے شائع ہونے والے مختلف انتخاب اور رسائل میں بطور غزل ہی درج ہے۔ اس کے علاوہ غزل ''یہ دن یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن'' کلیاتِ مجید امجد، ۱۹۸۹ء، ص۲۰۷ پر درج ہے مگر ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کلیاتِ مجید امجد، طبع نو (ستمبر۲۰۰۳ء) میں اس غزل کو بطور نظم بعنوان ''یہ دن یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن'' صفحہ نمبر ۲۰۷ پر درج کیا ہے۔

روایتی ہیئتوں میں مجید امجد نے سب سے زیادہ طبع آزمائی مثنوی کی ہیئت میں کی ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری کے حوالہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مجید امجد کی شاعری کا ابتدائی مزاج مثنوی میں متشکل ہونے کے لیے بے تاب ہے۔ عین ممکن ہے کہ جھنگ کی فضا اور مقامی زبانوں کے اثر کے تحت قافیے کی رنگا رنگی نے انہیں مثنوی کی طرف راغب کیا ہو۔ ان نظموں کے مطالعے سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مثنوی کی ہیئت میں لکھتے ہوئے ان کا انداز واقعات کو بیان کرنے کا سا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جیسے وہ اپنے خیال کے واضح ابلاغ کے متمنی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس صنف کو شعری سفر کے آغاز میں سب سے زیادہ برتا ہے۔ کلیاتِ مجید امجد (۱۹۸۹ء) میں اس ہیئت کے حوالے سے جو نظمیں ملتی ہیں ان میں ''موجِ تبسم'' (ص۴۱) ''محبوبِ خدا سے'' (ص۴۹) ''گاؤں'' (ص۵۱) ''حسن'' (ص۵۵) ''جھنگ'' (ص۵۸) ''یہی دنیا'' (ص۵۹) ''کون'' (ص۶۲) ''ریل کا سفر'' (ص۷۷) ''یہ سچ ہے'' (ص۷۹) ''انقلاب'' (ص۸۱) ''گر اِس جہاں میں جینا ہے'' (ص۹۵) ''گھٹا سے'' (ص۹۶) ''خدا'' (۹۷) ''گلی کا چراغ'' (ص۹۹) ''پژمردہ پتیاں'' (ص۱۰۳) ''کہاں'' (ص۱۰۴) ''عقدۂ ہستی'' (۱۰۵) ''دنیا'' (ص۱۰۸) ''چچی'' (ص۱۱۴) ''سوکھا تنہا پتا'' (ص۱۱۸) ''ملاقات'' (ص۱۲۰) ''دستک'' (ص۱۳۲) ''شناور'' (ص۳۳۳) شامل ہیں۔

یہ نظمیں (''شناور'' کو چھوڑ کر) ۱۹۴۴ء سے پہلے تخلیق کی گئی ہیں جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مثنوی کی ہیئت کو مجید امجد نے اپنے آغاز شاعری ہی میں استعمال کیا اور بعد میں انہوں نے اس صنف کو ترک کر دیا۔ مثنوی کے اندر روانی، تسلسل اور فکری جڑت، ان کے ابتدائی کلاسیکی مزاج سے لگا کھاتی ہے لیکن اس روش کو انہوں نے آنے والے ادوار میں بالکل ترک کر دیا تھا۔

مجید امجد نے مثنوی کی ہیئت میں بعض جزوی تبدیلیاں بھی کی ہیں مثلاً خیال کی رو، تسلسل اور مفہوم کے بہتر ابلاغ کے لیے انہوں نے مثنوی کے اشعار کو مختلف حصوں یا بندوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ اختیار کیا تاکہ نظم میں شامل خیال تسلسل

کی رو ہی میں نہ بہہ جائے اور قاری خیال کو محض بین السطور واردات سمجھ کر صرفِ نظر کر جائے مثلاً نظم ''صبح نو'' (۷۶) میں پہلے تین اشعار اور پھر چھ اشعار کے دو بند بنائے گئے ہیں۔ نظم ''صبحِ جدائی'' (ص ۸۶) میں چھ اشعار اور پھر تین اشعار پر مشتمل بند ہیں۔ نظم ''قیصریت'' (ص ۸۸) کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے پہلا حصہ پانچ اشعار، دوسرا چار اشعار اور تیسرا چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ نظم ''قیدی دوست'' (ص ۹۰) کا پہلا حصہ چھ اور دوسرا سات اشعار پر مبنی ہے۔ نظم ''نعتیہ مثنوی'' (ص ۱۳۹) چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں پندرہ، دوسرے میں آٹھ، تیسرے میں تیس اور آخری حصے میں چھبیس اشعار شامل ہیں اور نظم ''کل جب۔۔۔'' (ص ۲۶۳) کے تین حصے ہیں جب کہ اشعار کی تعداد بالترتیب تین، چھ اور ایک ہے۔

اس کے علاوہ مثنوی کی ہیئت میں چند ایک جزوی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں مثلاً نظم '' بُندا'' (ص ۹۴) مثنوی شکل میں ہے البتہ ایک اضافی مصرعہ'' کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا'' شروع اور آخر میں اضافی طور پر دے دیا گیا ہے:

کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا
رات کو بے خبری میں جو مچل جاتا میں
تو ترے کان سے چپ چاپ نکل جاتا میں
صبح کو گرتے تری زلفوں سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا ملول

آخر میں نظم کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے:

یوں تری قربتِ رنگیں کے نشے میں مدہوش
عمر بھر رہتا مری جاں میں ترا حلقہ بگوش
کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا

ایک اور نظم ''سیرِ سرما'' (ص ۱۱۷) میں آخری مصرعہ کو تین سطروں میں بانٹ دیا گیا ہے:

پوہ کی سردیوں کی رعنائی
آخر ِشب کی سرد تنہائی

آخری شعر ملاحظہ ہو:

ہوں رواں آتشیں خیالوں میں گم
آہ تم!
کتنے سرد مہر
ہو تم۔۔۔!

(مشمولہ ''کلیاتِ مجید امجد''، مرتبہ خواجہ محمد زکریا، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۷)

مثنوی کے علاوہ مجید امجد نے ''مثلث'' ہیئت کو بھی روایتی انداز کے ساتھ ساتھ جزوی تبدیلیوں اور قوافی کے اختلاف کے ساتھ برتا ہے۔ اُردو میں ''مثلث'' ہیئت کو مسمط کا ایک جزو سمجھا گیا ہے۔[۱۲] اور اس میں ہونے والے اختلاف کو

اس کے ہئیتی تغیر سے تعبیر کیا گیا ہے مگر اس بحث سے قطع نظر مجید امجد کو یہ ہیئت خاصی محبوب رہی ہے انہوں نے اپنی بہت سی نظموں میں اسے انفرادی طور پر اور دیگر اصناف کے ساتھ ملا کر استعمال کیا ہے، جن نظموں میں انہوں نے اس ہیئت کو انفرادی انداز اور جزوی تبدیلیوں کے ساتھ استعمال کیا ہے ان میں اہم نظمیں یہ ہیں: ''شاعر'' (ص ۴۳) ''زندانی'' (ص ۱۴۶) ''ارے یقینِ حیات'' (ص ۲۲۴) ''ایک خیال'' (ص ۲۳۹) ''ریوڑ'' (ص ۲۸۸) ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' (ص ۳۲۱) ''ایسے بھی دن'' (ص ۳۰۴) ''صدا بھی مرگِ صدا'' (ص ۳۵۲) اور ''متروکہ مکان'' (ص ۳۶۰)۔

نظم ''شاعر''، ''ایک خیال'' اور ''ہڑپے کا کتبہ'' ایسی نظمیں ہیں جن میں مثلث کے ہر بند میں شامل تینوں مصرعوں کو آپس میں ہم قافیہ رکھا گیا ہے۔ ''ہڑپے کا کتبہ'' سے مثال ملاحظہ ہو:

بہتی راوی ترے تٹ پر' کھیت اور پھول اور پھل
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھل بل
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی' اک ہالی اک ہل
(ص ۳۲۱)

''زندانی'' اور ''ریوڑ'' میں مثلث کے ہر بند کا تیسرا مصرعہ ہم قافیہ رکھا گیا ہے۔ نظم ''ریوڑ'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر ایک ریوڑ کے تھکے قدموں کا مدہم آہنگ
جس کی ہر لہر دھندلکوں میں لڑھک جاتی ہے
مست چرواہا' چراگاہ کی اک چوٹی سے جب اُترتا ہے تو زیتون کی لانبی سونٹی
کسی چلتی ہوئی بدلی میں اٹک جاتی ہے
(ص ۲۸۸)

''ارے یقینِ حیات'' اور ''صدا بھی مرگِ صدا'' میں مثلث کا ہر تیسرا مصرعہ مستزاد کے انداز میں آیا ہے۔ ''ارے یقینِ حیات'' میں ہر تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہے جب کہ ''صدا بھی مرگِ صدا'' میں ہر مثلث کا دوسرا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

یہ دور رفتہ تبسم' جو میرے ہونٹوں پر
ترے اشارۂ ابرو سے لوٹ آیا ہے
یہ زیست کی سوغات!
سیاہیوں میں گھرے طاق و گنبد و ایواں
کی اوٹ سے یہ ابھرتی ہوئی شعاعوں کے
لپکتے بڑھتے ہات!
(''ارے یقینِ حیات'' ص ۲۲۴)

نہ کوئی سقفِ منقش، نہ کوئی چترِ صریر
نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک
بس اک تودۂ خاک
ضمیرِ ارض پہ کھینچی گئی لہو کی یکسر
اور اس کا ایک بھی چھینٹا نہیں سرِ قرطاس
بہ مصحفِ احساس
(''صدا بھی مرگِ صدا''، ص ۳۵۲، ۳۵۳)

نظم ''متروکہ مکان'' میں ہر مثلث کا دوسرا مصرعہ مستزاد کے انداز کا ہے اور مصرعوں کے درمیاں قافیے کا اہتمام رکھا گیا ہے مثلاً

یہ محلے، یہ گھروندے، یہ جھروکے یہ مکاں
ہم سے پہلے بھی یہاں
بس رہے تھے سُکھ بھرے آنگن، سنہری بستیاں
راکھ ہوتی ہڈیوں کے گرم گارے میں گندھی
گرتے اشکوں میں ڈھلی
اب یہی اینٹیں ہماری عظمت ِ افتادگی
(''متروکہ مکان''، ص ۳۶۰، ۳۶۱)

مثلث ہیئت ہی میں مجید امجد نے بعض نادر تجربات بھی کیے ہیں یعنی دو مثلثوں کو ملا کر ایک بند کا تاثر پیدا کیا ہے۔ بظاہر یہ نظمیں مسدس کی شکل میں نظر آتی ہیں مگر درحقیقت ان کے اجزائے ترکیبی میں مثلث ہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان نظموں میں ''طلوعِ فرض'' (ص ۱۴۸) اور ''آورگانِ فطرت سے'' (ص ۹۲) کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

''طلوعِ فرض'' کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے اور اِس شعر کو نظم کے آخر میں دوہرایا گیا ہے اس کے بعد دو مثلثوں کو جوڑا گیا ہے۔ ایک بند دو مثلثوں پر مشتمل ہے، ہر بند کی پہلی مثلث کے دوسرے اور تیسرے مصرعہ کو ہم قافیہ رکھا گیا ہے، بظاہر دو مثلثوں کو اکٹھا تو کر دیا گیا ہے مگر ان سے تشکیل پانے والے بند میں معنی ربط اور تسلسل کو قائم رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

سرِ بازار انسانوں کا انبوہ
کسی دست ِ گل اندوزِ حنا میں
زمانے کی حسین رتھ کی لگامیں
کسی کف پر خراشِ خارِ محنت

عدم کے راستے پر آنکھ میچے
کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے
(''طلوعِ فرض''، ص۱۴۸)

اس بند میں پہلے تین مصرعے یعنی پہلی مثلث کو ملاحظہ کریں تو اس کا دوسرا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ملے گا اور اگلی مثلث میں یہی اہتمام برقرار رکھا گیا ہے۔ دو مثلثوں کے اس اجتماع کو نظم کے باقی بندوں میں دُہرایا گیا ہے۔ مثلث کے ضمن میں یہ نادر تجربہ ہے۔ یہی انداز نظم ''آوارگانِ فطرت سے'' میں ہے مگر یہاں قوافی کا نظام ذرا مختلف ہے۔ دو مثلثوں کو ملایا گیا ہے دونوں مثلثوں کے پہلے مصرعوں کو ہم قافیہ اور ہر مثلث کے دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ رکھا گیا ہے۔ اس ترکیب سے ایک بند کی تشکیل کی گئی ہے اور نظم کے بقیہ تین بندوں میں بھی یہی اہتمام ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ مثلاً

بتا بھی مجھ کو ارے ہانپتے ہوئے جھونکے
ارے او سینۂ فطرت کی آہِ آوارہ
تری نظر نے بھی دیکھا کہیں وہ نظارہ
کہ لے کے اپنے جلو میں ہجوم اشکوں کے
کسی کی یاد جب ایوانِ دل پہ چھا جائے
تو اِک خرابِ محبت کو نیند آ جائے
(''آوارگانِ فطرت سے''، ص۹۲)

چہار مصرعی قطعہ کا رواج اُردو شاعری میں بہت عام ہے، رباعی کے برعکس چہار مصرعی قطعہ اوزان اور قوافی کے اعتبار سے زیادہ آزادی اور آسانی سے کہی جانے والی ہیئت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شعراء نے اس ہیئت کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔

مجید امجد کے یہاں بھی بہت سی نظمیں اسی ہیئت میں نظر آتی ہیں مگر انہوں نے قوافی کے استعمال اور نظم کی فکری نمو پذیری کے عمل میں بعض مقامات پر مختلف اشکال بنائی ہیں (تفصیل آگے ملاحظہ ہو)۔ ''ہوائی جہاز کو دیکھ کر'' (ص۴۵) ''دل دریا سمندر روں ڈونگھے'' (ص۱۵۴) ''دُور کے پیڑ'' (ص۱۵۸) ''ریڈنگ روم'' (۱۶۲) ''ایک نظم'' (ص۱۷۰) ''بارش کے بعد'' (ص۱۷۵) ''ایک پُرنشاط جلوس کے ساتھ'' (ص۱۷۸) ''اور آج سوچتا ہوں'' (۲۰۵) ''منزل'' (ص۲۲۰) ''مقبرۂ جہانگیر'' (ص۲۷۶) ''دیکھ اے دل'' (ص۲۸۷) ''حرفِ اوّل'' (ص۳۰۵) وغیرہ چہار مصرعی قطعہ کے حوالے سے چند اہم نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں چہار مصرعی قید میں رہتے ہوئے بھی تجربات کیے گئے ہیں مثلاً نظم ''دیکھ اے دل'' روایتی انداز کے قوافی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

دیکھ اے دل، کیا سماں ہے، کیا بہارِ شام ہے
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں، انمول ہیں

نہر کی پٹڑی کے دو رویہ، مسلسل دُور تک
برگدوں پر پنچھیوں کے غل مچاتے غول ہیں
(''دیکھ اے دل''ص۲۸۷)

دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم ردیف و ہم قافیہ ہے۔

نظم ''مقبرۂ جہانگیر'' میں چار چار مصرعوں کے بند بنائے گئے ہیں اور تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ رکھا گیا ہے:

زنگ آلود کمر بند، صدف دوز عبا
یہ محافظ، تہہ محراب عصا تھامے ہوئے
کھا نستی صدیوں کا تھوکا ہوا اک قصہ ہیں
اس گرتی ہوئی دیوار کا اک حصہ ہیں
(''مقبرۂ جہانگیر''ص۲۷۶)

نظم ''ہوائی جہاز کو دیکھ کر'' میں چار مصرعوں کے بند میں پہلا، تیسرا اور دوسرا، چوتھا مصرعہ ہم قافیہ رکھا گیا ہے۔

یہ تہذیب اور سائنس کی ترقی کا زمانہ ہے
رہے گا یوں بھلا کب تک درندوں کی طرح انساں
یہ علم و دانش و حکمت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے
ہوا میں لگ گیا اُڑنے پرندوں کی طرح انساں
(''ہوائی جہاز کو دیکھ کر''ص۴۵)

''دل دریا سمندروں ڈونگھے''؛ ''دُور کے پیڑ''؛ ''ریڈنگ روم''؛ ''بارش کے بعد'' اور ''ایک پُر نشاط جلوس کے ساتھ'' ایسی نظمیں ہیں جن میں مختلف تعداد میں مصرعوں کے بند بنائے گئے ہیں اور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جیسے یہ طویل بندوں پر مشتمل نظم ہے مگر ان نظموں میں چہار مصرعی قطعات کو الگ الگ کیا جائے تو قوافی کا مکمل نظام نظر آ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنی اعتبار سے یہ نظمیں چہار مصرعی قطعات اور مقرر کردہ قوافی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں مگر ان مصرعوں کو معنوی اعتبار اور فکری نمو پذیری کی خاطر اکٹھا کر دیا گیا ہے اور ضرورت پڑنے پر مختلف بندوں میں مصرعوں کی تعداد کو کم اور زیادہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اتنی آنکھیں، اتنے ماتھے، اتنے ہونٹ
چشمکیں، تیور، تبسم، قہقہے
اس قدر غماز، اتنے ترجماں
اور پھر بھی لاکھ پیغام اَن کہے

لاکھ اشارے جو ہیں اَن بوجھے ابھی
لاکھ باتیں جو ہیں گویائی سے دُور
دُور دل کے کُنجِ ناموجود میں
روز و شب موجود ' پیچاں ' ناصبور
(''دل دریا سمندروں ڈونگھے'' ص۱۵۴)

یہ آٹھ مصرعے معنوی اور فکری اعتبار سے ایک نمو اور اکائی کو ظاہر کرتے ہیں مگر ان کو چہار مصرعی قطعات میں با آسانی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے چار مصرعوں اور آخر کے چار مصرعوں میں دوسرا اور چوتھا شعر ہم قافیہ ہے اور یہ انداز پوری نظم میں موجود ہے۔ اس انداز کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

حسنِ تہذیب کا آئینہ خوبی۔۔۔ بازار
چہرۂ شہر پہ دو شوخ لٹوں کا جادہ
جس کے دو رویہ پُر آشوب کمیں گاہوں میں
جسم اور دل کے لذائذ کی صف ِ استادہ
راہگیروں کی نگاہوں کو صدا دیتی ہے

مینہ تھما ہے' اور ابھی ہلکی پھہار آتی ہے
کچکچاتے ہوئے کیچڑ کو کچو کے دیتی۔۔۔!
کھلکھلاتی ہوئی۔۔۔ قدموں کی قطار آتی ہے
(''بارش کے بعد'' ص۱۷۵۔۱۷۶)

پہلا بند بظاہر پانچ مصرعوں پر مشتمل ہے مگر یہ تقسیم معنوی ہے فنی اعتبار سے یہ چہار مصرعی قطعہ ہی ہے جس میں دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ رکھا گیا ہے۔

چہار مصرعی قطعہ میں ایک کامیاب اور نادر تجربہ نظم ''حرفِ اوّل'' ہے۔ پہلے اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

عمر ایسی الجھن میں گزری
کیا شے ہے یہ حرف و بیاں کا
عقدۂ مشکل
صورتِ معنی ' معنیٔ صورت
بیس برس کی کاوشِ پیہم

سوچتے دن اور جاگتی راتیں
اُن کا حاصل
ایک یہی اظہار کی حسرت
(''حرفِ اوّل''ص۲۰۹۔۲۰۸)

مندرجہ بالا دو بندوں میں پہلا بند ملاحظہ ہو کہ اس کے پہلے دونوں مصرعے چار چار ارکانِ بحر یعنی فعلن فعلن پر مبنی ہیں، تیسرا مصرعہ دو ارکان اور چوتھا پھر چار ارکان پر مشتمل ہے، یعنی ہر بند کا تیسرا مصرعہ مستزاد کے انداز کا ہے مگر جو اہم ترین اور فنی حوالے سے قابلِ غور بات ہے کہ نظم کے ہر بند کا تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہے اور چوتھا اپنے الگ قافیے کے ساتھ ہر بند میں ہم قافیہ ہے۔ یہ ہئیتی تجربہ اور اس کا بیان نہایت اہم اور مشکل تجربہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ نظم ''سفرِ حیات'' (ص۱۱۲) مربع ترجیع بند اور ''نفیرِ عمل'' (ص ۶۷) اور ''یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا'' (ص ۸۲) مخمس ترجیع بند میں تحریر کی گئی ہیں۔ روایتی ہیئتوں میں مخمس کی ہیئت میں ''پنواڑی'' (ص ۱۶۷) اور مسدس میں توسیعِ شہر (ص ۳۴۶) اور ''سفر درد'' (ص ۳۴۹) تحریر کی گئی ہیں۔ اسی طرح ''اقبال'' (ص ۴۴) ''حالی'' (ص۵۲) ''اقبال (ص۶۲) ''شرط'' (ص۶۲) اور ''درسِ ایام'' (ص ۲۲۶) وغیرہ ترکیب بند میں لکھی گئی ہیں مگر ان کے بندوں میں مصرعوں کی تعداد یکساں نہیں۔ ''آہ یہ خوشگوار نظارے'' ترجیع بند میں ہے مگر یہاں بھی مصرعوں کی تعداد مختلف ہے۔

اس کے علاوہ چند نظمیں اور اس کی روایتی ہئیتیں بھی قابلِ غور ہیں۔ مثال کے طور پر نظم ''دو دلوں کے درمیاں'' (ص ۳۸۰) مخمس ترکیب بند کی ہیئت میں جزوی تبدیلی کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ہر بند کے پہلے تین مصرعے متحد القوافی ہیں اور آخری دو مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہیں البتہ ہر پانچواں مصرعہ آدھا ہے یعنی مستزاد کی طرز پر:

شام کی بجھتی ہوئی لَو ' ایک ان بوجھی کسک
پانیوں' پگڈنڈیوں' پیڑوں پہ سونے کی ڈلک
جامنوں کے بور کی بھینی مہک میں دُور تک
جسم اندر جسم سائے' لب بہ لب پرچھائیاں
انگ انگ انگڑائیاں (''دو دلوں کے درمیاں''ص ۲۸۰)

نظم ''قیدی'' (ص ۷۱) اور ''صبح و شام'' (ص ۱۲۹) مسبع ترکیب بند کی ہیئت میں جزوی تبدیلی کے ساتھ ہیں جب کہ نظم ''ہری بھری فصلو'' (ص ۲۵۱) مسبع ترجیع بند میں ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی نظمیں طویل قطعہ کی شکل میں لکھی گئی ہیں جن میں ''نو وارد'' (ص ۵۷) ''رخصت'' (ص ۱۰۷) ''ساتھی'' (ص ۱۲۴) ''کون'' (ص ۲۸) اور ''جیون دیس'' (ص ۳۲۳) قابلِ ذکر ہیں۔ نظم ''افسانے'' (ص ۳۲۶) مستزاد ہیئت میں ہے اگرچہ مثلث اور مربع ہیئت میں مجید امجد نے مصرعوں کو مستزاد کے رنگ میں باندھا ہے مگر اس ہیئت کو زیادہ استعمال نہیں کیا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ مجید امجد نے ابتدائی دَور (۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۰ء) اور دوسرے دَور (۱۹۴۱ء تا ۱۹۵۸ء) کے ابتدائی چند سالوں میں روایتی ہیئتوں (بالخصوص مثنوی اور چہار مصرعی قطعہ) کو کثرت سے استعمال کیا ہے مگر اس عرصہ میں بھی وہ نظم کے نئے پیکروں کو تلاش کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں اس ضمن میں سب سے اعلیٰ ترین مثال ان کی نظم ''کنواں'' (ص ۱۱۵) کی ہے۔ یہ نظم فکری اعتبار کے ساتھ ساتھ فنی اور ہئیتی حوالے سے بھی مجید امجد کی افتادِ طبع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔[۱۳] چھوٹے بڑے آٹھ مصرعوں پر مشتمل ایک بند تشکیل دیا گیا ہے جب کہ نظم چار بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں جہاں قوافی کا نظام رکھا گیا ہے وہاں ہر بند کے بعض مصرعوں کو باہم قافیہ وردیف کا پابند کیا گیا ہے۔ نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

کنواں چل رہا ہے مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں' نہ فصلیں' نہ خرمن' نہ دانہ
نہ شاخوں کی باہیں' نہ پھولوں کے مکھڑے' نہ کلیوں کے ماتھے' نہ رُت کی جوانی
گزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیرتا' خوں رنگ پانی
کہ جس طرح زخموں کی دکھتی ٹپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی
ادھر دھیری دھیری
کنوئیں کی نفیری
ہے چھیڑے چلے جا رہی اک ترانہ
پُراسرار گانا
(''کنواں''، ص ۱۱۵)

اس بند میں پہلے چار مصرعے مربع شکل میں آتے ہیں۔ دوسرا' تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے' پھر دو چھوٹے مصرعے ہیں جو باہم ہم قافیہ ہیں جب کہ ساتواں مصرعہ اور آٹھواں مصرعہ بند کے پہلے مصرعے کے قافیہ کے مطابق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں فنی اور عروضی ترکیب اس طرح بنے گی کہ پہلے مصرعہ میں شاعر نے آٹھ مرتبہ ''فعولن'' کا رکن استعمال کیا ہے اور اسی ترتیب کو اگلے تین مصرعوں میں دہرایا ہے۔ چوتھے اور پانچویں مصرعہ میں رکنِ بحر دو مرتبہ استعمال ہوا' ساتویں مصرعہ میں چار مرتبہ اور آخری مصرعہ میں دو مرتبہ فعولن کا استعمال کیا گیا ہے اور یہی ترکیب نظم کے بقیہ بندوں میں استعمال کی گئی ہے ایک اور بند دیکھیں:

کنوئیں والا گادی پہ لیٹا ہے' مست اپنی بنسی کی میٹھی سریلی صدا میں
کہیں کھیت سوکھا پڑا رہ گیا اور نہ اس تک کبھی آئی پانی کی باری
کہیں بہہ گئی ایک ہی تند ریلے کی فیاض لہروں میں کیاری کی کیاری
کہیں ہو گئیں دھول میں دھول لاکھوں' رنگا رنگ فصلیں ثمر دار ساری
پریشاں پریشاں
گریزاں گریزاں
تڑپتی ہیں خوشبوئیں دامِ ہوا میں

نظامِ فنا میں

("کنواں" ص۱۱۶)

روایتی ہیئتوں کے استعمال اور اُن میں جزوی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مجید امجد نے اپنی نظموں میں دو ہیئتوں کے باہمی اشتراک سے نئی شکل بھی پیدا کی ہے' کلیاتِ مجید امجد میں ایسی نظموں کی بڑی تعداد موجود ہے'اس انداز کی ہیئتی اختراعات ان کے شعری مزاج اور تخلیقی وفور کو سمجھنے اور نظم کی فکری نمو پذیری میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر نوازش علی کی یہ رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ "مجید امجد صرف ہیئتی تجربات کا شاعر نہیں ہے اور صرف تجربات سے شاعری پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ہیئتی تجربہ اعلیٰ شاعری بھی ہو لیکن مجید امجد کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ہیئتی تجربے کو اپنے شعور اور جذبے کی بھٹی میں اس طرح بناتے' سنوارتے' تپاتے اور پکاتے ہیں کہ ہر تجربہ' تجربہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی شاعری بھی ہوتا ہے۔"(۱۴)

مجید امجد نے اپنی نظموں میں مثنوی اور مثلث کی ہیئت کے امتزاج سے کئی شکلیں بنائی ہیں مثلاً نظم "کارِ خیر" (ص۳۹۱) تین مثلثوں اور ایک مثنوی کے شعر پر مشتمل ہے۔نظم "بس اسٹینڈ پر" بھی مثنوی اور مثلث کے امتزاج کا نمونہ ہے۔ پہلے نو اشعار مثنوی کی ہیئت میں ہیں جب کہ آخری دو بند مثلث کے بنائے گئے ہیں۔مثال ملاحظہ ہو:

مگر اب تو یہ اونچی ممٹیوں والے جلو خانے میں بستا ہے
ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے
خدا اس کا' خدائی اس کی' ہر شے اس کی' ہم کیا ہیں
چمکتی موٹروں سے اُڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں

ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمتِ آدم
بسے گی اک نئی دُنیا' سجے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں' گلستاں میں نیا موسم

("بس اسٹینڈ پر" ص۲۷۰)

"نظم" (ص۳۵۱) کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں مثنوی اور چہار مصرعی قطعہ "ایک کوہستانی سفر کے دوران" (ص۱۸۸) اور "امروز" (ص۱۸۵) میں مثلث اور چہار مصرعی قطعہ کو اکٹھا کر دیا گیا ہے جب کہ "پامال" (ص۳۷۲) میں مربع اور مسدس کا امتزاج تشکیل دیا گیا ہے:

سورج نکلا' رنگ رچے
کرنوں کے قدموں کے تلے سوکھی گھاس پہ کھلتے ہوئے
پیلے پیلے پھول ہنسے

کرنوں کے چرنوں پر جب اس مٹی نے رکھ دیئے لب
مسلی گھاس پہ بجھ گئی سب ہنستی زندگیوں کی چھب
اس مٹی کے ذرّے ہم کیا کہیں اپنا قصہ ہم

(''پامال''ص۳۷۲)

دوہیئتوں کے امتزاج کے علاوہ بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں کثیر ہیئتی اشکال کو یک جا کیا گیا ہے۔ ''جبر واختیار'' (ص۱۹۲) میں مثلث،مخمس اور مسدس کو''یاد'' (ص۱۸۲) میں مثنوی' مثلث اور چہارمصرعی قطعہ کو جب کہ ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'' (ص۲۵۳) میں چہارمصرعی قطعہ' مثنوی' ترکیب بند اور کہیں مستزاد کو استعمال کیا گیا ہے۔ ان کثیر ہیئتی نظموں میں ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'' سب سے انوکھی اور فنی حوالے سے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اس طویل نظم میں جہاں مختلف ہیئتوں کو استعمال کیا گیا ہے وہاں مختلف بحور کے تجربات بھی کیے گئے ہیں۔نظم کے آغاز میں چار مصرعوں کا بند بنایا گیا ہے جس میں پہلے دو طویل اور آخری دو مختصر ہیں' پہلے دو مصرعے ہم قافیہ ہیں جب کہ بند کے چوتھے مصرعہ میں قافیہ کا اہتمام اس طرح کیا گیا ہے کہ نظم میں موجود اس انداز کے بند کے آخری مصرعہ سے ہم قافیہ ہوجاتا ہے۔اس انداز کے چونتیس بند مختلف ترتیب سے نظم میں آتے ہیں۔دو بند ملاحظہ ہوں:

کیا کہوں ' کتنے غموں ' کتنے غموں کی شکن آلود بساط
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی لپٹی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ میرا قصہ غم کوئی سنے' کس کو سناؤں' کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں' جس کو
پیتے پیتے مری اک عمر کٹی ہے اک عمر
دیکھتے ہو وہ جو اک جادۂ نورانی ہے

(''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب''ص۲۵۳)

پہلے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں اور ہر بند کا چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے یعنی طولانی' نورانی' نگہبانی' افشانی' ویرانی وغیرہ۔اس انداز کے پہلے بارہ بندوں کے بعد مثنوی کے آٹھ اشعار آتے ہیں جو نہ صرف ہیئتی تبدیلی ہے بلکہ بحر کی تبدیلی کو بھی واضح کرتے ہیں' ان اشعار کے بعد پہلے کی طرح چہارمصرعی بند آتے ہیں ان کی تعداد تیس ہے۔بعد میں آنے والے اشعار میں مجید امجد نے کئی ہیئتوں کو یک جا کر دیا ہے اور یہاں بحر بھی مختلف استعمال کی گئی ہے۔ان اشعار میں مثنوی' مثلث' مستزاد' چہارمصرعی قطعہ اور طویل قطعہ کا استعمال کیا گیا ہے اور نظم کے آخر میں پہلے کی طرح چہارمصرعی بند آتے ہیں اور ان کی

تعداد تین ہے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہیئت کے تجربات کے اعتبار سے یہ مجید امجد کی نمائندہ نظم ہے۔ اس نظم کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ جہاں ہیئت تبدیل ہوئی وہاں انہوں نے فکری مزاج کے اعتبار سے بحر کو بھی بدل دیا' ہیئت اور بحر کی تبدیلی نظم کی فکری بنیادوں کو مضبوط تر کرتی ہے۔

مجید امجد کی نظموں میں ہئیتی تجربات کی جو لہر نظر آتی ہے یقیناً اس کے پس منظر میں ان کا مطالعہ اور کھوج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے' ڈاکٹر خواجہ زکریا کو دیئے گئے انٹرویو میں انہوں نے انگریزی شاعری کی مختلف اشکال کے مطالعہ اور مشاہدے کا ذکر کیا تھا۔[15] یقیناً مجید امجد انگریزی شاعری میں مختلف ہئیتوں سے متاثر ہوئے اور اس کے بلاواسطہ یا بالواسطہ اثرات ان کی نظموں میں واضح شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انگریزی شاعری میں انہیں اسٹنزا کا انداز بہت پسند ہے۔ ان کی بہت سی نظموں میں اسٹنزا ہیئت کے انداز تبدیلیوں کے ساتھ نظر آ جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نوازش علی لکھتے ہیں:

''اسٹنزا فارم میں لکھی گئی نظموں کی بھی بیسیوں شکلیں بنتی ہیں اور ہر شکل بذاتِ خود ایک نئی ہیئت ہے۔''[16]

اسٹنزا کی ہیئت میں جزوی تبدیلیوں کے ساتھ لکھی گئی نظموں میں ''راجا پرجا'' (ص ۱۲۷) ''ہزاروں راستے ہیں'' (ص ۱۳۶) ''چولہا'' (ص ۱۶۵) ''ایک نظم'' (ص ۱۷۰) ''تیرے دیس میں'' (ص ۱۸۹) ''رودادِ زمانہ'' (ص ۲۰۲) ''کانٹے کلیاں'' (ص ۲۱۷) ''یہ فرشِ خاک'' (ص ۲۴۵) ''موجودگی'' (ص ۲۸۴) ''ایک فوٹو'' (ص ۳۳۶) ''زینیا'' (ص ۳۴۲) ''بہار'' (ص ۳۶۲) ''صبح کے اُجالے میں'' (ص ۳۶۳) ''لاہور'' (ص ۳۸۴) ''جہان قیصر و جم میں'' (ص ۱۹۸) ''مشرق و مغرب'' (ص ۲۱۰) ''اکھیاں کیوں مسکائیں'' (ص ۲۳۰) اور ''برہنہ'' (ص ۳۰۱) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔[17]

مجید امجد کے چالیس سالہ شعری سفر میں بہت سے مقامات ایسے آئے ہیں جہاں انہوں نے روایت اور عصری رویوں کو رَد و قبول کیا ہے۔ اپنی شاعری کے آغاز سے ۱۹۶۷ء تک (جو تین ادوار پر مشتمل ہے) کے دَور میں وہ نئے سے نئے شعری اور ہئیتی تجربے کی سمت سفر کرتے ہیں۔ وہ جہاں اُردو کی مروجہ ہئیتوں کے استعمال اور ان میں جزوی تبدیلیوں کو پسند کرتے ہیں وہاں انگریزی شاعری کی مختلف شکلوں کو اپنا شعری اور فنی تجربہ بناتے ہیں۔ ان کے شعری سفر میں آخری دَور (۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء تک) ایک دلچسپ صورتِ حال کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس دَور میں وہ ہئیتی تجربات سے ماورا ہوتے چلے جاتے ہیں اور آزاد نظم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں۔ اس دَور کی تقریباً دو سو نظمیں ایک خاص مزاج اور آہنگ کا پتہ دیتی ہیں۔ اس دَور میں وہ عروضی حوالے سے بھی ایک خاص انداز کو اپنا مستقل شعری اظہار بناتے ہیں۔ فعلن فعلن کی بحر میں وہ زحافات کے استعمال کے ساتھ ساتھ آزاد نظم میں اپنا اظہار پاتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ عروضی اور ہئیتی سطح پر جس رنگ' آہنگ اور مزاج کے وہ متلاشی تھے' یہ نظمیں اس کا واضح اظہار کرتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد امین:

''۔۔۔۔ یہ نظمیں اپنا ایک الگ مزاج رکھتی ہیں اور ایک خاص لہجے کی نشان دہی کرتی ہیں جس کو سانس کی طبعی رفتار کنٹرول کرتی ہے' اسے مصرعوں کی ترتیب اور

پنکچوایشن کی مدد سے ظاہر کیا گیا ہے۔''(۱۸)

اس انداز کی رائے کا اظہار ڈاکٹر نوازش علی نے بھی کیا ہے(۱۹) کہ مجید امجد کے آخری دَور کی نظمیں ان کے ہم عصروں کے مزاج سے بالکل مختلف ہیں۔ دراصل یہ نظمیں مجید امجد کے شعری اجتہاد کا پتہ دیتی ہیں اور پہلے ادوار سے اُسلوبیاتی سطح پر منقطع ہونے کا اعلامیہ بن جاتی ہیں۔

مجید امجد کے آخری دَور کی ان آزاد نظموں میں کہیں کہیں قوافی کا شعوری اہتمام کیا گیا ہے۔ مثلاً نظم ''۸ر جنوری ۱۹۷۲ء'' (ص۶۲۲) میں قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہے:

ان سالوں میں
سیہ قتالوں میں
چلی ہیں جتنی تلواریں بنگالوں میں
ان کے زخم اتنے گہرے ہیں روحوں کے پاتالوں میں
صدیوں تک روئیں گی قسمتیں —— جکڑی ہوئی جنجالوں میں
ظالم آنکھوں والے خداؤں کی اِن چالوں میں

مگر ایک دو مثالوں سے ہٹ کر آزاد نظم میں کہیں بھی قافیہ کو شعوری سطح پر استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اکثر نظمیں آزاد نظم کی طرح قافیہ کے نظام سے ماورا ہیں۔ یوں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجید امجد کا شعری سفر (ہئیتی سطح پر) روایتی ہیئتوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر وہ نئے سے نئے تجربے کی سمت سفر کرتے ہیں اور اپنی ہر نظم کے لیے نئی شعری ہیئت کو بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ۱۹۶۸ء کے بعد ان کے یہاں ہئیتی تجربات کا سفر تقریباً اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ آخری دَور کی نظموں میں جو تخلیقی جہت نظر آتی ہے وہ اُن کی فکری اور ذہنی تبدیلی کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ آخری دَور کی چند اہم آزاد نظموں میں ''اس دن اس برفیلی تیز ہوا'' (ص۴۵۲) ''ایکسیڈنٹ'' (ص۴۵۶) ''تب میرا دل'' (ص۴۶۲) ''فرد'' (ص۴۷۰) ''دن تو جیسے بھی ہوں'' (ص۴۸۱) ''پھولوں کی پلٹن'' (ص۴۸۳) ''گہرے بھیدوں والے'' (ص۵۰۰) ''یہ دو پہیے'' (ص۵۱۵) ''اپنی خوب سی اک خوبی'' (ص۵۲۲) ''کوہستانی جانور'' (ص۵۴۲) ''اپنے لیکھ یہی تھے'' (ص۵۴۴) ''دلوں کے اس آشوب'' (ص۵۴۸) ''بندے تو یہ کب مانے گا'' (ص۵۵۲) ''گداگر'' (ص۵۷۵) ''بندے جب تُو'' (ص۶۱۰) ''کبھی کبھی تو'' (ص۶۳۴) ''اور پھر اک دن'' (ص۶۶۸) ''خوردبینوں پہ جھکی'' (ص۶۷۷) ''دو پہیوں کا جستی دستہ'' (ص۶۸۷) ''جن لفظوں میں'' (ص۶۹۳) کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

مجید امجد کے ہئیتی تجربات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید اُردو شاعری میں مجید امجد ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں نادر اور نایاب ہئیتی تجربات کا پورا باب دکھائی دیتا ہے۔(۲۰)

حواشی وتعلیقات

۱۔ الطاف حسین حالی''مقدمہ شعروشاعری''(لاہور،اعتصام پبلشرز،س ن)
الطاف حسین حالی نے مندرجہ بالا کتاب میں شاعری اوراصلاحِ شاعری کے حوالے سے چند اہم موضوعات کو چھیڑا ہے اور مغربی اثرات کے تحت پروان چڑھنے والے شعور کو عام کرنے کی سعی کی ہے۔ اُردو شاعری کی روایت میں موضوعات، لفظیات تشبیہات و استعارات اور اُسلوب کی سطح پر جس طرح یکسانیت اور یک رُخا پن نمایاں ہونے لگا تھا حالی نے سب سے پہلے تنقیدی اور تجزیاتی انداز میں اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے،مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ کیجئے''مقدمہ شعروشاعری'' کے صفحات:

i۔ صفحہ نمبر ۳۲ اور ۳۳ (شاعری کی اصلاح)
ii۔ صفحہ نمبر ۳۵ اور ۳۶ (شعر کے لیے وزن ضروری ہے یا نہیں؟ قافیہ شعر کے لیے ضروری ہے یا نہیں؟)
iii۔ صفحہ نمبر ۴۹ اور ۵۰ (آمد اور آورد میں فرق)
iv۔ صفحہ نمبر ۵۳ اور ۵۴ (شعر میں کس قسم کی باتیں بیان کرنی چاہئیں؟)
v۔ صفحہ نمبر ۵۷ تا ۶۰ (شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟)
vi۔ صفحہ نمبر ۸۸ تا ۹۶ (نیچرل شاعری)
vii۔ صفحہ نمبر ۱۰۹ تا ۱۷۵ (غزل، قصیدہ اور مثنوی)

۲۔ i۔ آزاد نے اپنی تقریر کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا:

''۔۔۔۔اُمید ہے کہ جہاں اور محاسن وقبائح کی ترویج واصلاح پر نظر ہوگی، فن شعر کی اس قباحت پر نظر رہے گی۔ گو آج نہیں، مگر امید قوی ہے کہ انشائاللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔''

(دیباچہ''نظم آزاد''، محمد حسین آزاد،مرتبہ آغا محمد باقر (لاہور، شیخ مبارک علی،۱۹۲۶ء) ص ۲۱ بحوالہ ڈاکٹر عارف ثاقب''انجمن پنجاب کے مشاعرے''(لاہور،الوقار،۱۹۹۵ء) ص ۳۳۔

ii۔ ڈاکٹر عارف ثاقب نے اپنی کتاب''انجمن پنجاب کے مشاعرے''میں انجمن کے زیر اہتمام ہونے والے نظمیہ مشاعروں کو ترتیب دیا ہے جس سے اس دَور میں نظم کی روایت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔تفصیل کے لیے دیکھئے:صفحہ نمبر ۳۹ تا ۴۴ اور صفحہ نمبر ۶۳ تا ۳۲۵۔

۳۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے:

i۔ فوزیہ اشرف''مجید امجد کی شاعری میں ہیئت کے تجربات''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے (اُردو) اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور،۱۹۸۷ء،صفحہ نمبر ۲۶ تا ۵۷۔

ii۔ امتیاز حسین''مجید امجد کی شاعری کا فنی اور اُسلوبیاتی مطالعہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے (اُردو) گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ (پنجاب یونیورسٹی لاہور)۲۰۰۰ء،صفحہ نمبر ۸ تا ۱۳۔

iii۔ ن۔م۔راشد''مقالات ن۔م۔راشد''مرتبہ شیما مجید(اسلام آباد،الحمرا پبلشنگ،اوّل ۲۰۰۲ء)
(الف) صفحہ نمبر ۲۴ تا ۲۹ (مضمون بعنوان:''ہیئت کی تلاش'')
(ب) صفحہ نمبر ۳۴ تا ۳۷ (مضمون بعنوان:''نظم اور غزل'')

(ج) صفحہ نمبر ۲۳۹ تا ۲۴۳ (مضمون بعنوان: ''تکنیک کی آزادی اور اس کا مفہوم'')

iv۔ عظمت اللہ خان''سریلے بول''(مقدمہ) (کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۹ء)

۴۔ شمیم احمد''اصنافِ سخن اور شعری ہئیتیں''(لاہور، تخلیق مرکز، س ن) ص ۱۲،۱۳۔

۵۔ ایضاً ص ۱۴۔

۶۔ مجید امجد سے ایک انٹرویو از خواجہ محمد زکریا، مشمولہ ''گلاب کے پھول'' مرتبہ حیات خان سیال (لاہور، میری لائبریری، اوّل ۱۹۷۸ء) ص ۲۴۔

۷۔ ایضاً ص ۲۸، ۲۷۔

۸۔ ایضاً ص ۲۴۔

۹۔ ڈاکٹر نوازش علی''مجید امجد کا تصور ہیئت، روایتی ہئیتیں اور ہئیتی تجربات''(مضمون) مشمولہ کتابی سلسلہ 'عبارت' مرتبہ ڈاکٹر نوازش علی (راولپنڈی، دھنک پرنٹرز، ۱۹۹۷ء) ص ۱۶۷۔

۱۰۔ ڈاکٹر نوازش علی نے اپنے مضمون''مجید امجد کا تصور ہیئت، روایتی ہئیتیں اور ہئیتی تجربات''مشمولہ 'عبارت'' کے صفحہ نمبر ۱۶۸ پر مجید امجد کی غزلیات کی کل تعداد تقریباً چالیس بتائی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

۱۱۔ راقم کے پاس مجید امجد کے جو قلمی مسودات ہیں اُن میں یہ بطور غزل موجود ہے۔

۱۲۔ مسمط کے حوالے سے تفصیل سے دیکھیں:

شمیم احمد''اصنافِ سخن اور شعری ہئیتیں'' کا صفحہ نمبر ۱۲۱ تا ۱۲۶۔

۱۳۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

i۔ ڈاکٹر نوازش علی''مجید امجد کا تصور ہیئت، روایتی ہئیتیں اور ہئیتی تجربات''(مضمون) مشمولہ کتابی سلسلہ 'عبارت'' صفحہ نمبر ۱۷۶، ۱۷۷۔

ii۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا''مجید امجد کے ہاں ہیئتوں کا مطالعہ''(خصوصی لیکچرز، ترتیب افضال احمد) مشمولہ سہ ماہی ''القلم''(مجید امجد ایک مطالعہ) مرتبہ حکمت ادیب (جھنگ، جھنگ ادبی اکیڈمی، ۱۹۹۴) صفحہ نمبر ۱۵ تا ۱۷۔

۱۴۔ ڈاکٹر نوازش علی''مجید امجد کا تصور ہیئت، روایتی ہئیتیں اور ہئیتی تجربات''(مضمون) مشمولہ کتابی سلسلہ 'عبارت''، ص ۱۷۶۔

۱۵۔ مجید امجد سے ایک انٹرویو از خواجہ محمد زکریا، مشمولہ ''گلاب کے پھول''، ص ۳۰، ۲۹۔

۱۶۔ ڈاکٹر نوازش علی''مجید امجد کا تصور ہیئت، روایتی ہئیتیں اور ہئیتی تجربات''(مضمون) مشمولہ کتابی سلسلہ 'عبارت''، ص ۱۸۲۔

۱۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: ایضاً ص ۱۸۲ تا ۱۸۶۔

۱۸۔ ڈاکٹر محمد امین''توجیہہ''(کراچی، ڈائیلاگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء) ص ۶۷۔

۱۹۔ ڈاکٹر نوازش علی''مجید امجد کا تصور ہیئت، روایتی ہئیتیں اور ہئیتی تجربات''(مضمون) مشمولہ کتابی سلسلہ 'عبارت''، ص ۱۸۷۔

۲۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں:

i۔ فوزیہ اشرف''مجید امجد کی شاعری میں ہیئت کے تجربات''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے (اُردو) صفحہ نمبر ۵۸ تا ۸۹۔

ii۔ اختر عباس''مجید امجد کا شعری اُسلوب''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے (اُردو) گورنمنٹ کالج فیصل آباد (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ۱۹۹۱ء، صفحہ نمبر ۱۸۷ تا ۱۹۳۔

iii۔ امتیاز حسین''مجید امجد کی شاعری کا فنی اور اُسلوبیاتی مطالعہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے (اُردو) صفحہ نمبر ۸ تا ۳۹۔

iv۔ یوسف حسن''مجید امجد کی شعری ہئیتیں، عہد وار مطالعہ''(مضمون) مشمولہ ''دستاویز''(مجید امجد نمبر) لاہور، (جلد ۲ شمارہ ۵، ۱۹۹۱ء) صفحہ نمبر ۱۴۴ تا ۱۵۹۔

آخری آئس کیوب

محمد حامد سراج

''تم چاہو بھی تو اس یقین کو واپس نہیں لاسکتیں جسے تم نے ریزہ ریزہ کردیا ہے۔''

''میں تمہاری تھی ہی کب۔۔۔؟''

''تو پھر وعدے گرہ میں کیوں باندھے تھے۔''

''تم بھول رہے ہو۔کوئی لمحہ یاد کرو جب میں نے شادی کا وعدہ کیا ہو۔''

''لیکن تمہاری ہر ادا میرا یقین تھی۔وہ میرے بچپن کی بھول تھی۔میری زندگی تم نے ریزہ ریزہ کردی اور وہ تمہارے بچپن کی ادا ٹھہری۔مجھے خبر تو کردی ہوتی کہ تم میرے ساتھ لکن میٹی کھیل رہی ہو۔۔۔''اس کے چہرے پر تشنج کی کیفیت تھی۔

''بچپن میں تو کتنے بہت سے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔تم بھی مجھے ایک کھیل سمجھ کر بھول جاؤ۔''وہ اسے کہنا چاہتا تھا۔

''وہ تمہاری جنسی تسکین کا سامان تھا۔ایک ایسا سامان جسے تم نے ایک حد تک استعمال کیا۔بلکہ وہ ٹشو پیپر تھا جسے تم نے استعمال کے بعد وقت کی ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔''

لیکن وہ خاموش رہا وہ کوئی گری ہوئی بات کہہ کر اپنی محبت کی توہین کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔گلاس میں اس نے آخری آئس کیوب ڈالا۔۔۔

دور تک اداسی کی چادر بچھی تھی۔بہت دیر وہ اس اداس منظر میں گم رہا۔وہ اداسی کی تہہ میں چھپے منظر کو دیکھنے کا متمنی تھا۔اس نے آہستگی سے اداسی کی چادر کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا۔دور تلک اس کے آنسوؤں کے موتی بکھر گئے۔۔۔یہ موتی ہو بہو اس مکیش کے سوٹ کی طرح تھے جو پہلی ملاقات پر اس لڑکی نے پہن رکھا تھا۔جو اس کی زندگی تھی بھی اور نہیں بھی۔اسی تھی اور نہیں کے درمیان اس کے وجود کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔وہ کئی دن سے ان میں سے وہ ٹکڑا تلاش کر رہا تھا جس پر اس کی مکمل کہانی لکھی ہوئی تھی۔اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔کہانی کا سرا کچے دھاگے کی طرح کب ٹوٹ گیا۔اسے تو برسوں پہلے کی دیکھی ہوئی ایک فلم کا سین بھی دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ فلم کا سین اس کی یادوں کے پردے پر چلنے لگا۔ہیرو بہت اکھڑ اور

خودسر تھا۔ ایک روز اس کی محبوب نے اسے ایک کچے دھاگے سے باندھ دیا۔ وہ باڈی بلڈر تھا لیکن وہ اس کمرے میں اس دھاگے سمیت گھومتا رہا اس دھاگے کو توڑ کر وہ اس دائرے سے نہ نکل سکا جس میں وہ اسے باندھ گئی تھی۔ اس کا ایک دوست جو اس وقت موجود تھا۔۔۔اس نے کہا۔۔۔

''یار یہ کچا سا دھاگہ تم سے نہیں ٹوٹ پا رہا۔''

تو اس نے کہا ''تمہیں اس کی مضبوطی کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ اپنی آواز کے ساتھ باندھ جاتی تو بھی میں بندھا رہتا یہ تو پھر دھاگہ ہے۔''

اس نے آہستہ سے قمیص پر لگی سلوری رنگ کی مکیش کو چھو کر دیکھا۔

''یہ کھردری مکیش تمہارے بدن کو تکلیف نہیں دیتی۔''

''نہیں اس کی چبھن مجھے اچھی لگتی ہے۔۔۔''

''کیوں۔۔۔؟''

''بس مجھے کھردری چیزیں اچھی لگتی ہیں۔''

''یادیں اگر کھردری ہوں۔۔۔؟''

''ان کے بارے ابھی میں نے سوچا نہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے تم محبت کو کس مقام پر لے آئی ہو۔۔۔''

''یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ محبت کیا سوچ کر کی جاتی ہے۔۔۔؟''

''تم روح اور بدن کے درمیان جو دیوار ہے اس کا قضیہ تو چکا دو۔۔۔''

''روح بھی تمہاری ہے اور بدن بھی۔۔۔ میں اپنے بدن کی کسی سرحد پر کوئی پہرہ نہیں بٹھاؤں گی۔'' اس نے آہستگی سے اداسی کی چادر کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا۔

دور تک یادوں کا سبزہ بچھا تھا جس میں ننھے ننھے واقعات کے پھول کھلے تھے۔ ابھی وہ منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے بھی نہ پایا تھا کہ پھر اداسی کا کہرا اتر آیا۔ سارا سبزہ اور واقعات کے پھول دھندلا گئے۔ وقت کی چادر سرکی اور اس کا سانس رک گیا۔ ''ایک رات میں تمہارے گھر مہمان ٹھہرا تھا۔ یاد ہے یا بھول گئی ہو۔۔۔؟''

''مجھے آدھی رات کو اپنے پاؤں پر تمہاری انگلیوں اور پھر ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا۔ میری سانس اٹک گئی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اگر کسی کی آنکھ کھل گئی۔ تو میری ساری عمر اکارت چلی جائے گی۔ یاد ہے اس رات میرے پاؤں کی سرزمین پر تمہارے ہونٹوں نے کتنی مسافت طے کی تھی۔ میری البم میں کوئی ایک یاد کسی اکلوتی یاد کا ادھورا ٹکڑا ہوتا تو میں اسے لاشعور کی اندھیری کوٹھری میں پھینک کر تالا لگا دیا۔۔۔ لیکن تم نے تو پورا شہر بسا دیا۔ اس شہر پر تو میں آنچ بھی نہ آنے دوں۔ کون اپنی سلطنت اپنے ہاتھوں برباد کرتا ہے۔۔۔؟''

''شاید تم پلٹ آؤ۔۔۔!''

''اب یہ ناممکنات میں سے ہے۔ ناممکنات کے اس خطے میں' میں کسی امکان کو داخل نہیں ہونے دوں گی۔ تم اتنا معمولی سا کام نہیں کر سکتے۔۔۔''

''کون سا۔۔۔؟''

''یہی کہ مجھے بھول جاؤ۔۔۔ محبت میں لوگ کیا سے کیا کر گزرتے ہیں اور تم مجھے نہیں بھلا سکتے۔''

''تمہیں بھلانا شاید آسان ہوتا لیکن کیا کروں۔ تمہارا ایک ایک لمس میرے بدن پر سلگتا ہے اور مجھے سانس لینا عذاب ہو جاتا ہے۔۔۔''

''تم اپنے بدن سے میرے بوسے کھرچ کیوں نہیں دیتے۔''

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔''

''چلو میں تمہیں ایک طریقہ اور بتاتی ہوں۔۔۔''

''مکان کا رنگ بوسیدہ ہو جائے تو اسے نیا پینٹ کرا لیا جاتا ہے۔ کچھ صاحبِ ثروت لوگ شوقیہ بھی عمارت دوبارہ پینٹ کرا لیا کرتے ہیں۔ تم ایسے کرو۔ تمہارے بدن کی عمارت پر جہاں جہاں میرے لمس اور بوسوں کا پینٹ ہے۔ وہاں کسی اور لڑکی سے نیا پینٹ کروالو۔'' آئیس کیوب گلاس میں ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپا۔۔۔ پانی چھلکا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔؟''

''زندگی کی حقیقت کہہ رہی ہوں تم سے۔۔۔''

''اس سے آگے ایک لفظ بھی اپنے ہونٹوں کے دروازے پر مت بلانا۔''

''ایک بار اور۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟''

''یاد ہے ایک بار میں تمہارے لیے جوس لائی تھی۔ تمہیں تنگ کرنے کے لیے میں نے اس میں نمک ملا دیا۔'' اس کی آنکھ میں ایک نمکین آنسو اترا۔۔۔

''اس بات کو رہنے دو۔''

''کیسے رہنے دوں۔''

''وہ تمہارا مشورہ تھا۔۔۔''

''میں مان رہی ہوں اور میرا مشورہ تم نہیں مان رہے کہ پینٹ کرالو۔''

''میں اپنی وہ بات اس سے پہلے کہ تمہارے ہونٹوں سے ادا ہو۔۔۔ جاننا چاہوں گا۔''

''بزدل نہ بنو۔۔۔ سنو۔۔۔'' تم نے کہا تھا کہ ''محبت اور نفرت دونوں ایسے جذبے ہیں جو دل سے پھوٹتے ہیں۔

اس لیے زندگی میں اگر کبھی نفرت کرنے کی نوبت آجائے تو وہ بھی تم مجھی سے کرنا' میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دل سے پھوٹنے والا کوئی جذبہ کسی اور کے نام ہو۔۔۔''

''تمہارے چہرے پر جھوٹ لکھا ہے۔''

''آئس کیوب پانی میں حل ہو چکا تھا۔۔۔''

''میرا یہ خیال تھا میں ایک آئس کیوب تھا۔ تمہارے بدن کے گلاس میں جو روح کا مشروب تھا۔ میں اس میں حل ہو چکا ہوں۔۔۔''

''مجھے صرف اتنا بتادو۔۔۔تم اتنی کیوں بدل گئی ہو۔۔۔''

''میرا اب گھر ہے۔۔۔خاوند ہے۔۔۔سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''لیکن تم نے وعدے کیوں کیے تھے۔۔۔''

''اچھا بابا۔۔۔میں اپنی غلطی کی معافی چاہتی ہوں۔۔۔''

وہ غلطی نہیں تھی۔۔۔میری زندگی تھی۔''

دور تک اداسی کی چادر بچھی تھی۔۔۔اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور دیکھا کہ رات اتر رہی ہے اور کسی کی مخملیں انگلیوں کا لمس اس کے بالوں میں اس کے نام اپنی ہر سانس لکھتا چلا جارہا ہے۔

اسے اس کڑی کی تلاش تھی جہاں سے اس محبت میں دراڑ پڑی۔ وہ اس کے دل میں اندر تک اتر کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے مجھ سے نفرت کیوں ہوئی ہے۔۔۔؟

وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اسے ایسے محسوس ہوا کوئی اس کے اندر رنگ برنگے آئس کیوب ڈالتا جارہا ہے۔ وہ بے حد اداس تھا۔ اس کی اداسی بانٹنے والی ہی اس سے دور ہوگئی تھی وہ اس کا درد بھی اسی سے بانٹا کرتا تھا اور اپنا بھی اور اب سارے غم سارے دکھ آئس کیوبز میں ڈھل گئے۔ اس کی سرد مہری کے آئس کیوب دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہیں میرے جسم کے اندر جو روح کا مشروب ہے یہ غم اس کی کیمسٹری ہی نہ بدل دیں میں نے تو اپنے اندر اس کی نرم و ملائم یادوں کو ڈیکوریٹ کیا تھا۔۔۔عجیب پاگل ہے۔ کہتی ہے نیا پینٹ کرالو۔

اس کی آوارگی اس کے اندر ہی رہی۔ اس نے سارے دوازے بند کر دیے۔ اندر ہی اندر وہ گھلنے لگا۔ اس کی ہر کاپی ہر کتاب وہی تھی۔ اس کی کالج کا فائل کور اور فائل میں لگے کاغذ میں وہی تھی۔ اس کے دل میں' گھر پر' سڑک' پارکوں میں' کار چلاتے ہوئے' بستر پر جاتے ہوئے شام سویرے سارے کے سارے موسم وہی تھی۔

ایک دن تنہائی میں بیٹھ کر اس نے اپنے آپ کو پرکھا تو اپنی محبت میں اسے کہیں دراڑ نظر نہ آئی۔ اس نے اپنے آپ سے اتنے سوال کیے کہ بے حال ہوگیا۔ یاد کی دھند سے ایک چھوٹی سی کرن نکلی۔۔۔

''ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔۔۔؟''

''تم یہ مت بھولا کرو کہ تم ہر بات پوچھ سکتی ہو۔۔۔''
''قرب کے لمحات میں تم ایک حد پر آ کر ٹھہر کیوں جاتے ہو۔''
''شیکسپیئر نے کہا ہے کہ محبت ایک پاکیزہ پھول ہے، جو گناہ کی دھوپ سے مرجھا جاتا ہے۔''
''خاندانی منصوبہ بندی کے بعد شیکسپیئر کو کون خاطر میں لاتا ہے۔۔۔''
''اتنی بے باک گفتگو تمہارے منہ سے جچتی نہیں۔''
''تم سیاچین گلیشیر ہو۔۔ برف۔۔۔ ٹھنڈے ٹھار، میں تمہیں نہیں پگھلا سکی۔۔۔ جانے وہ کون خوش نصیب ہو گی جو تمہیں مکمل حاصل کر لے گی۔''
''کہانا۔۔۔اس طرح کی بات تمہارے منہ سے۔۔۔!''
''کوئی اور بات کہو۔''
''انسان گناہ کی حد سے گزر جائے نا تو سب سے پہلے وہ اپنی نظروں میں گرتا ہے۔''
''تم زندگی کے گرم لمحات میں یہ سرد فلسفہ کہاں سے لا ڈالتے ہو۔''
''ایک بات کہوں۔۔۔''
''کہو۔''
''شادی کے بعد بھول جاؤ گی۔۔۔؟''
''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لمحۂ موجود میں تمہاری ہوں میں۔۔۔ مکمل تمہاری۔ تم مجھے پورا کا پورا کیش کر لو۔ کل آنے والا تمہیں کیش نہ کرانے دے تو پھر مجھے نہ کہنا۔''
''لیکن میں کیا کروں۔۔۔؟ جب بھی ایک حد سے آگے گزرنے کی سوچتا ہوں۔ محبت کی عمارت زمین بوس ہوتی دکھائی دیتی ہے۔''
''ایک تو یہ تمہارے فلسفے تمہیں لے بیٹھے ہیں۔۔۔ بزدل ہو تم۔۔۔ یہ کرو وہ نہ کرو ایسا نہ ہو جائے ویسا نہ ہو جائے۔۔۔!''
''میں نے پوچھا ہے شادی کے بعد بھی یاد رکھو گی کیا۔۔۔؟''
''کیسے وعدہ کر سکتی ہوں۔ شادی کے بعد عورت کے مسائل بالکل مختلف ہوتے ہیں۔''
''مجھے بھی ایک مسئلہ سمجھ کر اپنے دل میں رکھ لینا۔''
''لیکن خاوند کی موجودگی میں تمہیں حل کیسے کروں گی۔''
''جیسے آئس کیوب مشروب میں حل ہو جاتا ہے۔''
''مجھے تمہارے ماں باپ کی عزت عزیز ہے۔''

''اور میں۔۔۔؟''

''تم نہیں سمجھو گی۔۔۔میں صرف اپنی یاد کے البم میں وہ یادیں سنبھال کر رکھنا چاہتا ہوں۔ جو زندگی کے تنہا لمحوں میں میرا ساتھ نبھائیں۔ گناہ آلود یادیں عذاب ہوتی ہیں۔ عمر بھر کی پھانس بن جاتی ہیں۔ میں اپنے من میں کوئی پھانس رکھنا نہیں چاہتا۔''

''کتنے موقعے تم نے گنوا دیے۔۔۔!''

''کوئی موقع نہیں گنوایا میں نے۔۔۔سب سنبھال رکھا ہے۔''

اس کے سر میں درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کے دو بجے تھے۔ سرہانے سائیڈ ٹیبل پر پانی کا گلاس رکھا تھا۔ اِسے اُٹھاتے ہوئے اس کی نظر فون پر پڑی۔۔۔پھر اداسی کی دھند چھا گئی۔ رات گئے تک میرے ساتھ وہ فون پر باتیں کیا کرتی تھی۔۔۔ ہنسنا' کھلکھلانا' باتوں کے سرے پکڑ کر رات گیے تک کھینچا تانی۔۔۔کیا مجھے آخری حد سے گزر جانا چاہئے تھا۔۔۔؟ وہ اس حد سے کیوں گزرنا چاہتی تھی۔۔۔اسے یاد آیا۔۔۔

ایک بار اس کی قمیص کا بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگی ''بٹن لگا دوں۔۔۔؟''

''بٹن کی بجائے کوئی یاد ٹانک دو۔''

وہ بہت دیر گھر میں بٹن تلاش کرتی رہی۔ جب نہیں ملا' تو وہ روہانسی ہو کر کہنے لگیں۔

''اب میں کیا کروں۔۔۔؟''

''کہا ہے نا۔۔۔اپنی کوئی ادا ٹانک دو۔''

''نہیں۔۔۔ٹھہرو۔۔۔ایک منٹ۔۔۔ایک آئیڈیا۔۔۔!''

یہ کہہ کر تم نے اپنے ململ کے کرتے سے ایک بٹن توڑا۔۔۔تمہاری قمیص کے منقش گلے پر نفیس کڑھائی تھی اور سامنے سفید رنگ کے تین بٹن تھے۔ تم نے ململ کے کُرتے کا بٹن توڑا۔ سوئی پکڑی اس میں دھاگہ ڈالا اور میری کف میں بٹن لگا دیا۔

''چلو ایسے کرو جہاں سے میں نے تمہارے لیے بٹن توڑا ہے تم وہاں اپنے ہونٹوں سے ایک یاد کا بٹن ٹانک دو نہیں تو یہ خالی گریبان اچھا نہیں لگے گا۔''

ایسی ہی یادوں کے سہارے زندہ رہنے کا سوچا تھا اس نے۔

اس نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھایا۔ اسے معلوم تھا۔ باقی کی رات اسے اس کی یادوں کی چٹائی پر ہی گزارنی تھی۔ وہ ویسے بھی اب زبردستی نیند لانے کی مشقت سے نہیں گزرتا تھا۔

تم چاہو بھی تو اس یقین کو واپس نہیں لا سکتیں جسے تم نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

پھر وہی کیوب۔۔۔برف' گلاس' یادوں کے ٹکڑے۔۔۔!

ایک ہی عذاب۔۔۔شادی کے بعد ایک روز اس نے اسے چھونا چاہا تو وہ یوں تڑپی جیسے اسے بچھو نے ڈنگ مارا

ہو۔۔۔یہ ایسا غیر متوقع عمل تھا کہ اسے سکتا ہو گیا۔۔۔وہ تو اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔اس کے گریبان میں اپنی ساری سانسیں رکھ کر اس کی زندگی میں یقیں رقم کیا کرتی تھی وہ تو پہروں اس سے الگ نہیں ہوا کرتی تھی۔اس کی باتیں عجیب دل آویز ہوا کرتی تھیں۔

''ایک کام تو کرو۔۔۔''

''کہو۔۔۔''

''اپنی زبان کی نوک سے یاد کا ایک آویزہ تو میرے کانوں میں ڈال دو۔''

اس کے کانوں میں آویزوں کی جگہ میری یاد تھی۔اُس نے انگلیوں میں انگوٹھیوں کی جگہ میرے ہونٹوں کا لمس پہن رکھا تھا۔اس کی ناک میں جو کوکا ہے وہ میری زبان کی نوک کے لمس کی انمٹ یاد ہے۔

یہ ہوا کیا۔۔۔شادی کے بعد سارے منظر کیوں بدل گئے۔یہ اتنی گنجلک کیوں تھی کہ میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔میں جو اسے اپنا سب کچھ مان بیٹھا اور وہ۔۔۔؟

یہیں آ کر اس کی سوچ اُدھڑنے لگتی۔۔۔سوچ کی روئی کے گالے اُچھالتا وہ اپنے آپ سے الجھتا۔اور سوال کرتا تو کیا اس شام جب وہ اپنی وسیع وعریض کوٹھی میں اکیلی تھی اور اس نے کہا تھا۔

''آج تو سرحد کے پار اُتر جاؤ۔''

یہی ایک نقطہ اسے ہمیشہ عذاب دیا کرتا تھا۔

''کیا یہ لمس کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے کافی نہیں ہیں۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔۔۔عورت جب لمس سے گزرتی ہے تو وہ کسی بھی سرحد کو خاطر میں نہیں لاتی۔''

''لیکن اس کا انجام سوچا ہے تم نے۔۔۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم پاگل ہو۔''

''یہی تو میں تمھیں سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ میرا پاگل پن دور کرو۔''

''یہ مجھ سے کبھی نہیں ہوگا''

''بزدل۔''

''مجھے یہ بزدلی گوارا ہے۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔''

''یہ جو میں تمہاری بانہوں میں کتنی دیر سمائی رہتی ہوں یہ گناہ نہیں ہے۔''

''چپ۔۔۔!''

''اور یہ جو تم نے اپنی یادوں کے انگنت لمس میرے بدن پر پینٹ کر ڈالے ہیں یہ گناہ نہیں ہیں۔ اگر تمہیں اتنا ہی گناہ کا خیال ہے تو پھر مجھے ملنے کیوں آتے ہو۔۔۔؟''

''گناہ کے گراف میں فرق ہوتا ہے۔''

''کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

پانی کا گلاس خالی تھا۔۔۔وہ اُٹھ کر فریج تک گیا۔ وہاں سے ٹھنڈی بوتل نکالی۔ غٹا غٹ پانی پیا۔ ساری تھیوریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ جب وہ چاہتی تھی اس وقت اس کے سامنے شیکسپیئر کا فلسفہ تھا اور اب اسے اس کی طلب ہوئی تو وہ جانے کیوں اسے عذاب دینے پر تُلی گئی ہے۔ حالاں کہ اب کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

کیا وہ ایک خواب تھی ایک دھوکا۔۔۔ایک بزنس جو فلاپ ہو گیا۔

کیا وہ میرے ساتھ سیکچول بزنس ڈیل کرتی رہی۔۔۔؟

میری تو وہ انوسٹمنٹ تھی۔۔۔اگر وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تو میں تو اپنے بزنس سے بھی گیا۔۔۔کیا محبت ایک بزنس ہے۔۔۔؟ اس نے مجھے اپنی وقتی جنسی تسکین کے لیے استعمال کیا۔۔۔لیکن آخری حد تو میں نے پار نہیں کی اس نے تو مجھے کئی بار پہلے پہل اشاروں کنایوں میں اور پھر شرم کی چادر اتار کے دعوت دی۔۔۔اسے تو مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرنی چاہیے تھی۔ کہ میں نے اس کی عزت کا خیال رکھا۔ کیا وہ تحائف کا کاروبار تو نہیں تھا۔ قیمتی تحائف مجھ سے وصول کرتی رہی۔

اس نے سوچا ہو۔۔۔کاٹھ کا الو' مل گیا۔۔۔اگر یہ سب بزنس تھا تو میں نے اسے کیش کیوں نہیں کرایا میں کیا کروں۔۔۔

اگر میں نے محبت کو آلودہ نہیں کیا تو اب میرے سر میں یہ کیسا سودا سمایا ہے کہ میں اس کے ساتھ آخری حد سے گزرنا چاہتا ہوں۔۔۔!

وہ تکیہ گود میں رکھے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس کے انگوٹھوں پر رات اتر آئی اور کسی کے نرم ہونٹ سفر کرنے لگے۔

وال کلاک نے تین گھنٹیاں بجا کر اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔

مجھے بس ایک سوال کا جواب چاہیے۔۔۔اس نے مجھے نظر انداز کیوں کیا۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔۔۔؟

اس کا پورا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

ہوش کے ناخن تلاش کرنے میں اسے بہت دیر لگی۔۔۔وہ پھر اٹھ کر فرج تک گیا اس نے فرج کھول کر ٹھنڈے بوتل نکالی۔۔۔پیپسی کا ڈھکن ہوا میں اچھالا۔۔۔گھونٹ گھونٹ اسے حلق سے اتار کر سوچنے لگا۔

''میرے اندر کمی کس چیز کی تھی۔۔۔؟''

میں نامرد بھی تو نہیں تھا۔۔۔پھر۔۔۔؟ شادی کے بعد اسے ہوا کیا ہے۔۔۔؟

اس کی شادی پر میں نے دل کھول کر پیسہ لٹایا۔ ساری راتیں میں نے وہیں گزاریں۔ زندگی کی ہر خوشی میں اس کا ساتھ دیا۔ شادی کے بعد بھی تو میں نے اسی حد میں رہنا تھا' اسی حد پر اس سے ملاقات کا سامان کرنا تھا جہاں شادی سے پہلے ملا کرتا تھا۔۔۔ لیکن اس نے تو ایک ہلکا سا لمس بھی برداشت نہیں کیا۔۔۔ میرے چھونے سے یوں ہاتھ جھٹکا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

شاید اسے زندگی میں کسی بچھو کی ہی تلاش رہی ہو۔۔۔

فون کی گھنٹی پر وہ چونکا۔۔۔ CLI پر اسی کا نمبر تھا۔۔۔

اب یہ کیا چاہتی ہے۔۔۔؟

جب بات ہی ختم ہو گئی۔ اب راکھ میں کیا رکھا ہے۔۔۔؟ کیا میں فون اٹھا لوں۔۔۔؟

لیکن کس لیے۔۔۔؟

باب ہی بند ہو گیا۔

شاید کوئی رمق باقی ہو۔

جانے کتنی دیر گھنٹی بجتی رہی۔ وہ خلا میں گھورتا رہا۔ اس کا محبت' بے لوث جذبوں سے ایمان اٹھ گیا تھا۔ وہ ایک بے اعتبار وجود تھا جو دیوار پر اپنا ہی عکس دیکھتا اور اپنے آپ سے اُلجھتا تھا۔ میں نے ساری حیاتی اس آس میں یادوں کی کٹیا بنائی کہ عمر آرام سے کٹے لیکن وہ تو یوں بھول گئی جیسے ایک رات میرے پاؤں پر بھول کر رات بھر کہانی لکھتی رہی تھی' مجھے بھول جانا بھی اس کی ادا ٹھہری۔ مجھے زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اس دنیا میں کتنے بڑے بڑے سانحات گزر جاتے ہیں۔

وقفے کے بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

اس نے بادلِ ناخواستہ فون اٹھایا۔۔۔

''فون کیوں نہیں اٹھا رہے۔۔۔؟''

اس نے ریسیور بات کیے بغیر واپس رکھ دیا۔ اس کے اندر کی توڑ پھوڑ نے اسے اس حد تک دل برداشتہ کر دیا تھا کہ ساری یادیں اور اس کی وہ ادائیں جو اس نے آج تک سنبھال کر رکھی تھیں۔ وہ انہیں کہیں پھینک آنا چاہتا تھا اس کے ساتھ گزرے وقت کی کرچیاں اس کے لیے سوہانِ روح بن گئیں

کیا اس سے انتقام لینا چاہئے۔۔۔؟

اس کے اندر انتقام نے زوردار انگڑائی لی۔ اس کے تراشیدہ جسم نے اسے پھر اندھا کر دیا۔ اس کی نظر دھندلانے لگی۔ مجھے انتقام لینا چاہئے۔ ساری عمر کی آگ سے تو بہتر ہے۔ ایک ہی دفع اس مرحلے سے گزر جاؤں۔۔۔!

(۲)

''تمہیں اس کی شادی کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

''مان نہیں رہا۔''

''کیسے نہیں مانے گا۔''

ہر بات میں زبردستی نہ کیا کریں اولاد جوان ہو جائے تو اسے ڈانٹنا اور اس پر ہاتھ اٹھانا مناسب نہیں ٹھہرتا۔۔۔!

''کوئی رشتہ ہے تمہاری نظر میں۔''

''رشتوں کی کیا کمی ہے۔۔۔وہ ہاں تو کرے۔''

وہ تیار ہو کر کہیں نکل رہا تھا۔۔۔

''بیٹا۔۔۔ایک منٹ بیٹھو۔''

''امی۔۔۔مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔''

''بیٹا۔تمہاری شادی کی عمر نکل جائے گی۔''

''امی۔۔۔میں کوئی لڑکی نہیں۔''

''پھر بھی بیٹا۔۔۔؟''

''امی میری کوئی پسند نہیں۔''

''تو پھر میں اپنے طور پر کوشش کروں۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

''بیٹا۔۔۔''

''امی مجھے اجازت۔۔۔دیر ہو رہی ہے۔''

''اس نے گاڑی نکالی۔''توجہ سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔۔۔''

ٹریفک کے رش میں اس کے اندر یاد کا ایک کیوب گرا اور وہ پھر بے ترتیب ہو گیا۔

شادی کیسے کرلوں میں۔۔۔شادی کر لینے سے میرے جسم پر نیا پینٹ ہو جائے گا اور نئے پینٹ کے ہونے سے پرانا رنگ خود مجھی کو نظر نہیں آئے گا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل جائے تو شاید شادی بھی میرے لیے آسان ہو جائے۔ مجھے نفرت کے اس چشمے کو تلاش کرنا ہے جس نے میری محبت کو زہر آلود کر دیا۔۔۔اس کا خاوند اگر مجھ سے زیادہ وجیہہ ہوتا' خوبصورت ہوتا تو بھی میں مان لیتا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟ اگر مجھے نظر انداز ہی کرنا تھا۔تو پھر اتنی بہت سے یادیں تعمیر کرنا ضروری تھا کیا۔۔۔؟

''میں شادی ہرگز نہیں کروں گا۔''

اسے مسلسل سر کا درد رہنے لگا تھا اس کا ذہن منتشر تھا۔اب کئی روز گھر میں شادی کی باتیں ہوتی رہیں گی۔ایک میری شادی نہ کرنے سے کون سا نظام رک رہا ہے۔ساری زندگی فیصلے مسلط ہوتے رہتے ہیں اگر شادی نہ کی جائے تو کیا زندگی نہیں

گزر سکتی۔اب میں کسے جابتاؤں کہ ذہن میں اگی یادوں کا عذاب کیا ہوتا ہے۔ایسے معاملات کسی سے بانٹے بھی تونہیں جا سکتے۔

کتنی باتیں کتنے وعدے۔۔۔؟۔۔۔ہر ملاقات پر پیار کی موسلا دھار بارش کے بعد کیسے قوسِ قزح کی طرح رنگ اس کے چہرے پر پھیل جاتے تھے۔کیسی عجیب لڑکی تھی۔اتنے برسوں میں ایک بار بھی تو اس نے اندازہ نہیں ہونے دیا کہ وہ یہ کھیل کیوں کھیل رہی ہے۔کیا انسان اتنا بھی بدل سکتا ہے کہ برسوں کی یادوں کو ردی سامان کی طرح پھینک دے۔اس نے ایک بار کہا تھا۔

تم غم کیوں کرتے ہو،جب ایک بار کہہ دیا ہے میں تمہاری ہوں۔یہ کوئی سیاسی اور حکومتی فیصلہ نہیں جو نظریہ ضرورت کے تحت بدل لیا جائے،لیکن وہ بھی حکومت کی طرح بدل گئی۔

میں شادی نہیں کروں گا۔۔۔یہ آخری فیصلہ اس نے اپنے آپ کو سنایا اور توجہ سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔۔۔

(۳)

دسمبر ایک سرد صبح تھی۔وہ لان میں دھوپ اور کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ملازم نے آ کر کہا:

''صاحب۔۔۔آپ کا فون ہے۔''

''کس کا فون ہے۔۔۔؟''

''کوئی خاتون ہیں۔''

''اسے کہہ دو میں گھر پر نہیں ہوں۔۔۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔''

''ٹھہرو۔۔۔''اس نے ملازم کو کارڈلیس فون لانے کو کہا:

''کیسے ہو۔۔۔؟''

''جی۔۔۔فرمایئے۔اس کا لہجہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔''

''میں کل کی فلائیٹ سے پہنچی ہوں۔کل لنچ سیرون کیفے میں میری طرف سے۔۔۔!''

''تم میری زندگی سے نکل چکی ہو۔''

''جھوٹ بھی بولنے لگ گئے ہو،مجھے تمہاری الجھن دور کرنی ہے،مجھے اب تم پر ترس آتا ہے۔''

''مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کہیں سے پینٹ تو نہیں کرا لیا۔''

''میں ایسی فضول باتیں سننا بھی اب گوارا نہیں کرتا۔''

''بہت بڑے بزنس مین ہو گئے ہو۔۔۔نا۔۔اب تو اکثر سنا ہے بیرونِ ملک دوروں پر رہتے ہو۔''

''یہ بے کار کی باتیں چھوڑو۔۔۔میری نجی زندگی پر گفتگو کا تمہیں کوئی حق نہیں۔''

''تو کل سیرون کیفے آ رہے ہو۔۔۔نا۔۔۔؟''

''آ جاؤں گا۔''

اس نے فون بند کر دیا۔۔۔اس کے سامنے ایک بار پھر سارے منظر کھل گئے۔

دور تک اداسی کی چادر بچھی تھی۔ بہت دیر وہ اس اداس منظر میں گم رہا۔ وہ اداسی کی تہہ میں چھپے منظر کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس نے آہستگی سے اداسی کی چادر کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا۔ دور تلک اس کے آنسوؤں کے موتی بکھر گئے۔۔۔یہ موتی ہو بہو اس مکیش کے سوٹ کی طرح تھے جو پہلی ملاقات پر اس لڑکی نے پہن رکھا تھا۔ جو اس کی زندگی تھی بھی اور نہیں بھی۔ اسی تھی اور نہیں کے درمیاں اس کے وجود کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ کئی دن سے ان میں سے وہ ٹکڑا تلاش کر رہا تھا جس پر اس کی مکمل کہانی لکھی ہوئی تھی۔ ویٹر ان کے سامنے گلاس رکھ گیا۔ ماحول خواب ناک تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں موسیقی گھلی ہوئی تھی۔ اس کے خاوند نے کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ مکیش کے اسی سوٹ میں آئی تھی۔ کھانے پر وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے شریکِ سفر کے ساتھ خوش اور مطمئن ہے۔ کھانے پر وہ ماضی کی کوئی نہ کوئی ایسی یاد کھول لیتی جس پر اس کے خاوند کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کچھ زیادہ ہی چمٹ کر بیٹھی تھی۔ کھانے کے دوران وہ مسلسل یہی سوچتا رہا اس نے مجھے کیوں بلایا ہے۔۔۔؟

باتوں کے دوران اس نے ایک آئس کیوب پیپسی میں ڈالتے ہوئے ایک بات زور دے کر کہی۔

''تمہاری طرح انہیں شیکسپیئر کے مطالعے کا کوئی شوق نہیں۔۔۔یہ عملی آدمی ہیں۔'' سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کے اندر ایک جھپا کا ہوا۔۔۔ماضی کرلایا۔

''میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔۔۔؟''

''پوچھو۔۔۔!''

''تم ایک حد پر آ کر ٹھہر کیوں جاتے ہو۔''

''شیکسپیئر نے کہا ہے محبت ایک پاکیزہ پھول ہے جو گناہ کی دھوپ سے مرجھا جاتا ہے۔''

''خاندانی منصوبہ بندی کے بعد ان پابندیوں کو کون خاطر میں لاتا ہے۔۔۔''

اس نے مکیش کا سوٹ ایک نظر دیکھا۔

کھردری یاد ابھری۔ اس کی آنکھوں میں اس نے جھانک کر دیکھا تو اس کا خاوند مکمل کیوب کی صورت میں اس کی آنکھوں میں تحلیل ہو چکا تھا۔۔۔!

آخری آئس کیوب جانے اس نے گلاس میں کب ڈالا تھا۔۔۔؟ یہ اسے یاد نہیں تھا۔

لیکن جب وہ شیکسپیئر کا فلسفہ اوڑھ کر ہوٹل سے نکلا تو اس کے پورے بدن پر مکیش کے بوسے ناسور میں بدل چکے تھے۔

غزلیں

بیدل حیدری

ہم تم میں کل دُوری بھی ہو سکتی ہے — وجہ کوئی مجبوری بھی ہو سکتی ہے
پیار کی خاطر کچھ بھی ہم کر سکتے ہیں — وہ تیری مزدوری بھی ہو سکتی ہے
سُکھ کا دن کچھ پہلے بھی چڑھ سکتا ہے — دُکھ کی رات عبوری بھی ہو سکتی ہے
دشمن مجھ پر غالب بھی آ سکتا ہے — ہار مری مجبوری بھی ہو سکتی ہے

بیدلؔ یہ جو مجھ میں ایک کمی سی ہے
وہ چاہے تو پوری بھی ہو سکتی ہے

☆☆☆

یہ دل جو مضطرب رہتا بہت ہے — کوئی اس دشت میں تڑپا بہت ہے
کوئی اس رات کو ڈھلنے سے روکے — مرا قصہ ابھی رہتا بہت ہے
بہت ہی تنگ ہوں آنکھوں کے ہاتھوں — یہ دریا آج کل بہتا بہت ہے
مبارک اُس کو اُس کے تر نوالے — مجھے سُوکھا ہوا ٹکڑا بہت ہے
بیاض اس واسطے خالی ہے میری — مجھے افلاس نے بیچا بہت ہے
بہت ہی راس ہے صحرا لہو کو — کہ صحرا میں لہو اُگتا بہت ہے

بتوں کا کلمہ بھی پڑھتا ہے بیدلؔ
خدا کا نام بھی لیتا بہت ہے

☆☆☆

بہت ہشیار تھے قاتل ہمارے
قطاروں میں بٹھا کر سَر اُتارے
یہ آنسو ہیں کہ ناداروں کے بچے
یہ آنکھیں ہیں کہ خیراتی ادارے
کبھی جلدی بھی چھپ جاتا ہے سورج
پرندے سے کہو ہمت نہ ہارے
بھری رہتی ہیں آنکھیں آنسوؤں سے
پڑا رہتا ہوں دریا کے کنارے
مَیں سرگرمِ سخن ہوں یہ جو بیدلؔ
کہیں موجود ہیں مجھ میں شرارے

☆☆☆

گفتگو میں خوگر بے اعتدالی ہو گیا
سوچتا ہوں میں بھی کتنا لااُبالی ہو گیا
دل کے اندیشے بڑھے تو حسرتیں دل میں نہ تھیں
زلزلہ آنے سے پہلے شہر خالی ہو گیا
سہلِ غم نے آنکھ میں اُگنے نہ دی اشکوں کی فصل
یہ علاقہ بھی شکارِ قحط سالی ہو گیا
فاختائیں امن کے نغمے سُنا کر اُڑ گئیں
کچھ دِنوں سے یہ پرندہ بھی خیالی ہو گیا
مرگِ بیدلؔ پر دھمالیں ڈالنا مت بھولنا
اب تمہارے واسطے میدان خالی ہو گیا

☆☆☆

دل، کشمکش رنج و محن سے نہیں نکلا
یہ چاند ابھی اپنے گہن سے نہیں نکلا
معتوب سا، مصلوب سا، زندانی غم سا
انسان ابھی قیدِ بدن سے نہیں نکلا
اس دَور کو یہ حبس، وراثت میں ملا ہے
اس واسطے یہ دور گھٹن سے نہیں نکلا
کل میں نے گریبان سے پکڑا جو خزاں کو
اک پھول بھی دامانِ چمن سے نہیں نکلا
مَیں سوکھی ہوئی جھیل کا وہ ہنس ہوں بیدلؔ
جو پیٹ کی خاطر بھی وطن سے نہیں نکلا

☆☆☆

رات دن سوچنا سزا تو نہیں
دیکھنا ! مجھ کو کچھ ہوا تو نہیں
یہ جو آنکھوں میں گرد اُڑتی ہے
یہ سمندر کی بددُعا تو نہیں
آؤ! اس سے مکالمہ تو کریں
لاکھ پتھر ہے وہ خدا تونہیں
گنتا رہتا ہوں نیند میں تارے
نیند کا کام رتجگا تو نہیں
خیر و شر کی ہے جنگ جو مجھ میں
مَیں کہیں دشت ِکربلا تو نہیں
بیدلؔ اتنا اثر سخن میں ترے
یہ تجھے میرؔ کی دُعا تو نہیں

غزل

شہزاد احمد

اگرچہ کارِ دنیا کچھ نہیں ہے
مگر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے

اُس کے پاؤں کی مٹی ہے دنیا
جو دنیا کو سمجھتا کچھ نہیں ہے

اگر دھرتی پہ بادل ہی نہ برسیں
تو یہ دریا اکیلا کچھ نہیں ہے

بہت ناراض ہیں اِک دوسرے سے
مگر دونوں میں جھگڑا کچھ نہیں ہے

بدل جاتی ہے ہر شے لمحہ بھر میں
مگر دراصل ہوتا کچھ نہیں ہے

عجب اِک خوف سا طاری ہے مجھ پر
مگر شہزادؔ ہونا کچھ نہیں ہے

غزلیں

غلام حسین ساجد

زمیں کا رنگ اُڑا' آسماں کا رنگ اُڑا
ذرا سی دیر میں سارے جہاں کا رنگ اُڑا

سیاہ نیند میں کھُلنے لگا جمالِ شب
فشارِ خواب سے کون و مکاں کا رنگ اُڑا

وجودِ عکس میں صورت دکھائی دی کس کی
یہ کس کو دیکھ کے آبِ رواں کا رنگ اُڑا

کسی وسیلے سے مجھ تک پہنچ ہی جائے گا
کبھی جو راحتِ آئندگاں کا رنگ اُڑا

دیارِ صبح میں آیا ہوں کس ارادے سے
مَیں کہہ چکا تو مرے میزباں کا رنگ اُڑا

سُنا ہے' لطف سے بڑھ کر اُسے ہنسی آئی
مرے طلسم سے جب کارواں کا رنگ اُڑا

مَیں اُس چراغ کی حدت نہ سہ سکا ساجد
فروغِ وصل سے مجھ ناتواں کا رنگ اُڑا

☆☆☆

اُتر کر میرے دل سے قریۂ حیرت میں نکلے گا!
وہ جس صورت میں آیا تھا' اسی صورت میں نکلے گا

کبھی مہرِ درخشاں کی طرح دِن کو اُجالے گا
کبھی وہ آئنہ بن کر شبِ ظلمت میں نکلے گا

بدل سکتی نہیں موسم بدلنے سے بہار اُس کی
کہ وہ عجلت میں آیا تھا نہ اب عجلت میں نکلے گا

اُسے نسبت رہے گی دیر تک شہری غزالوں سے
وہ دشتِ نجد کی جانب کبھی فرصت میں نکلے گا

مرے ہونے سے بے کل ہی سہی آسودگی میری
مگر اک صبر کا پہلو مری وحشت میں نکلے گا

زباں پر آ نہ پائے گا کبھی بھولے سے نام اُس کا
یہ گوہر میرے سینے سے کہیں غربت میں نکلے گا

بہت ارزاں رہا مَیں دیر تک اس دھیان میں ساجد
مرے دشمن کا حصہ بھی مری قیمت میں نکلے گا!

☆☆☆

عالمِ خواب سے اِک عالمِ امکانی تک
کھینچ لائی مری مشکل مجھے آسانی تک

رُوح کا بوجھ لیے پھرتا ہے گلیوں گلیوں
کوچۂ صبر سے اس کوئے پشیمانی تک

دشت میں خلق کیا رنگِ سخن سے گرداب
کون پہنچے گا مری فکر کی جولانی تک

سامنے آن کھڑا ہے وہی آئنہ بدن!
اُڑ گئی چشم نگوں سار سے حیرانی تک

شرم آئی تھی مجھے اپنے قدوقامت پر!
ماں کے جب ہونٹ نہ پہنچے مری پیشانی تک

بعض اوقات خوش آتے نہیں میرے جی کو
سعدیؔ و حافظؔ و قاآنیؔ و خاقانیؔ تک

شاعری نامہ بری جب سے بنی ہے ساجدؔ
منع ہے اُس کے علاقے میں اجز خوانی تک

☆☆☆

زمیں روشن رہے گی، آسمان روشن رہے گا
مری موجودگی سے یہ مکاں روشن رہے گا

میسر آ گئی آسودگی جب اس نگر کو!
چھتوں پر رنگ، صحنوں میں دھواں روشن رہے گا

کھلے گی ایک دن سب پر حقیقت آئنے کی
طلسمِ خواب سے سارا جہاں روشن رہے گا

اسے محفوظ رکھنے کی نکالوں کوئی صورت!
کہ میرے بعد یہ منظر کہاں روشن رہے گا

کسی دل میں اُترنے کی اُسے تکلیف کیوں دیں!
وہ سب آنکھوں میں بے نام ونشاں روشن رہے گا

مجھے کیا علم تھا میرے مقدر کا ستارہ!
جہاں تم پاؤں رکھو گے وہاں روشن رہے گا

ہمارے دم سے ہے تابندگی اس قافلے کی!
نہ ہم ہوں گے نہ میرِ کارواں روشن رہے گا!

بجھا سکتا نہیں ہے کوئی میرے آئنے کو!
اندھیرے میں بھی یہ آبِ رواں روشن رہے گا

کھلے گا نیند کے صحرا میں جو بھی پھول ساجدؔ
ورائے لذتِ وہم و گماں روشن رہے گا

☆☆☆

نظر اُسی کی ہوئی ، آئنہ اُسی کا ہوا!
کہ حسن و عشق کا ہر سلسلہ اُسی کا ہوا

سکون مِل نہیں پائے گا اب مجھے گھر میں
کہ میرا صبر، مرا حوصلہ اُسی کا ہوا

مجھے بس اتنی خبر ہے کہ چل رہا ہوں مَیں
سفر اُسی کا ہوا، فاصلہ اُسی کا ہوا

اُلٹ پلٹ کے بڑے شوق سے پڑھیں گے ہم
نظامِ دہر اگر زائچہ اُسی کا ہوا!

مگن رہا وہ اندھیرے کے کھوج میں لیکن
کسی چراغ سے پھر رابطہ اُسی کا ہوا

یقیں ہے راحتِ فردا سے ہاتھ دھونے کا
جو میری فکر بھی اخ وسوسہ اُسی کا ہوا

محیط تھا جو مرے کاروبارِ وحشت پر
سمٹ کر آج وہ اِک زاویہ اُسی کا ہوا

دِیا ہے نام جسے کارزارِ ہستی کا!
شکست و فتح بھی اِک مرحلہ اُسی کا ہوا

اب اُس کو میری خوشی کا خیال ہے ساجدؔ
سو میرے غم سے بڑا سانحہ اُسی کا ہوا!

غزل

نجیب احمد

دیکھیں اگر تو آئنہ آدار ہے کوئی اور
لیکن بہشتِ آب میں چہرہ ہے کوئی اور

تو اپنا ہمسفر تھا تجھے جانتے تھے ہم
لوٹا ہے تو کہ لوٹ کے آیا ہے کوئی اور

تجھ سے بچھڑ کے بھی دل وحشی ہے مطمئن
یعنی نواحِ شوق میں صحرا ہے کوئی اور

کچے گھڑوں کے ساتھ اُتر آئے پار ہم
جانا ہے جس کے پار وہ دریا ہے کوئی اور

اس شہر بے مثال میں سب بے مثال ہیں
تجھ سا ہے کوئی اور نہ ہم سا ہے کوئی اور

کاغذ پہ تجھ کو سطر کیا عمر بھر نجیبؔ
پر حجلۂ سطور میں بیٹھا ہے کوئی اور

غزلیں

سعداللہ شاہ

حسرتِ وصل ملی لمحۂ بیکار کے ساتھ
بخت سویا ہے مرا دیدۂ بیدار کے ساتھ

کیا کرے جذبۂ وارفتگیٔ شوقِ نہاں
دل کو گل رنگ کیا گوشۂ پُرخار کے ساتھ

اے مرے دوست! ذرا دیکھ مَیں ہارا تو نہیں
مرا سَر بھی تو پڑا ہے مری دستار کے ساتھ

ایک احساس پسِ حرفِ تسلی اس کا
کاش وہ گھاؤ لگاتا مجھے تلوار کے ساتھ

نہ کوئی خندہ بلب ہے نہ کوئی گریہ کناں
تیرا دیوانہ پڑا ہے تری دیوار کے ساتھ

وقت خود ہی یہ بتائے گا کہ مَیں زندہ ہوں
کب وہ مرتا ہے جو زندہ رہے کردار کے ساتھ

مَیں نے لکھی ہے حدیثِ غمِ دوراں دل پر
دل بھی اب گریہ کناں ہے مرے اشعار کے ساتھ

ایک آشوب نگر ہوں مَیں درونِ خانہ
ایک ماتم بھی ہے شامل مرے اظہار کے ساتھ

کیوں وہ انگشتِ بدنداں ہے مری حیرت پر
مَیں تو آئینہ ہوا نرگسِ بیمار کے ساتھ

برلبِ نازِ گلِ حرفِ دُعا میرے لیے
اے فلک دیکھ مجھے چشمِ گہر بار کے ساتھ

☆☆☆

شامِ فراقِ یار نے ہم کو اُداس کر دیا
بخت نے اپنے عشق کو حسرت و یاس کر دیا

خوئے جفائے ناز پر اپنا سخن ہے منحصر
ہم نے تو حرف حرف کو حرفِ سپاس کر دیا

کب تھے زمانہ ساز ہم' کب تھے سراپا راز ہم
ہم کو ادائے شہر نے' شہر شناس کر دیا

اے کہ ہوائے تند! آ' شعلۂ جاں بڑھائے جا
غم نے تو آہِ سرد کو اپنی اساس کر دیا

اپنی تو بات بات سے آتی ہے یوں مہک کہ بس
جیسے ہمیں بھی یار نے پھولوں کی باس کر دیا

غزلیں

آغا نثار

نقشِ غم ہو بہو رہے نہ رہے تو کہ جو ہے وہ تو رہے نہ رہے
لفظ تھک کر کہیں نہ سو جائیں سفرِ گفتگو رہے نہ رہے
حسن کی لو سے دل منور ہے روشنی چار سو رہے نہ رہے
تتلیاں ' دوڑتے ہوئے بچے تتلیوں میں لہو رہے نہ رہے
دل کے صحراؤں میں بھٹکتا ہوا شعلۂ آرزو رہے نہ رہے
موت کو بھی ہے زندگی درکار زندگی میں نمو رہے نہ رہے
پھول کو خاک پر بکھرنا ہے خاک پہ رنگ و بو رہے نہ رہے
اس سے بچھڑا ہوں اس لیے آغا
وہ ملے جستجو رہے نہ رہے

☆☆☆

دل پہ اک زخم کے نشاں کے ساتھ مٹ گئے ہم بھی داستان کے ساتھ
یاد تیری سفر ہے صحرا کا!! دھوپ چلتی ہے سائبان کے ساتھ
اِک تری دسترس میں سات فلک میں اُڑوں کیا تری اُڑان کے ساتھ
سازشیں پانیوں نے کیں ایسی ہم بھی اُبھرے نہ بادبان کے ساتھ
ایک ہی میں شکار اُس کا نہ تھا گر پڑا پیڑ بھی مچان کے ساتھ
ہر زباں کا وہی سوال بنی بات کی تھی جو راز دان کے ساتھ
میرا منصف بنا دیا اس کو
جو بدلتا ہے ہر بیان کے ساتھ

غزلیں

جمشید مسرور

یوں ہمیں درد کے انعام دیئے جاتے ہیں جیسے مجبوروں پہ احسان کیے جاتے ہیں
دل کی فریاد پہ پہرے نہ بٹھاؤ لوگو آنکھ چیخ اُٹھتی ہے جب ہونٹ سیئے جاتے ہیں
ابرِ تعبیر میں پنہاں ہے اگر بارشِ سنگ خواب کیوں آئینہ آئینہ دیئے جاتے ہیں
بجھ گیا دل ہی تو پھر موت کی خواہش کیا ہے
تم بھی زندہ ہو جہاں ہم بھی جئے جاتے ہیں

☆☆☆

تنہائی کے ٹھنڈے لمحے اور بھی دل میں آگ لگائیں آگ بھڑک اُٹھے جب دل میں پھر آنکھیں پانی برسائیں
ہم سے دل کا حال نہ پوچھو اے غم خوار وا ے دم ساز و اپنی ہی اِک مجبوری ہے اور کسی کو کیا بتلائیں
حال کے ویرانوں میں رقصاں مایوسی کے کالے سائے ماضی کے افسانے جیسے پریوں کے آنچل لہرائیں
مَیں تو ڈوب رہا ہوں لیکن کچھ تو بچے ویرانیٔ دل سے رات کے دریا اور نہ چڑھنا چاند ستارے ڈوب نہ جائیں
آنکھ تو کھل جاتی ہے لیکن ہوتا ہے محسوس ہمیشہ
پچھلی راتوں کو اب اکثر چلتی ہیں بے کار ہوائیں

غزلیں

محمود عامر

کبھی جو ذہن میں آ جائیں سال اُداسی کے
بکھیر کر ہمیں رکھ دیں ملال اُداسی کے

کہ جیسے آج بھی مٹھی میں دل چلا آئے
قریب سے بھی جو گزریں خیال اُداسی کے

اِک عمر سے جو مری جان و دل پہ چھائے ہیں
سمیٹ لو کبھی آ کر وہ بال اُداسی کے

شراب ایسی رُتیں تھیں تو ساتھ تھا جب تک
بچھڑ کے تجھ سے پڑے دل پہ جال اُداسی کے

کھلا ہے جب سے خوشی عارضی سی ہوتی ہے
تو خود سے کر لیے رشتے بحال اُداسی کے

ملے گا کون سی رُت میں ہمارا چاند ہمیں
جواب مانگ رہے ہیں سوال اُداسی کے

☆☆☆

بچھڑ کے تجھ سے ہماری آنکھوں میں خواب کیسے اُتر سکیں گے
خزاں رُتیں ہوں تو ان رُتوں میں گلاب کیسے اُتر سکیں گے

ابھی تو آنکھیں گزشتہ خوابوں کے ٹوٹنے سے لہولہو ہیں
ابھی سے ان میں نئی محبت کے باب کیسے اُتر سکیں گے

نہ فون پر رابطہ کیا ہے نہ خط ہی تم نے مجھے لکھا ہے
یہی رہا تو وفا نگر کامیاب کیسے اُتر سکیں گے

وہ کچے گھر جو حویلیوں کی ہیں اوٹ میں سوچتا ہوں ان میں
ٹھٹھرتے موسم جب آئیں گے آفتاب کیسے اُتر سکیں گے

جہاں ہر اک دل منافقت کی روش پہ اُترے ہوئے کھڑا ہو
مجھے بتاؤ کہ پھر وہاں انقلاب کیسے اُتر سکیں گے

جب اہلِ کوفہ ہی قاتلوں کے گروہ سے مل گئے ہوں عامرؔ
یزیدیوں کے تمہی کہو پھر نقاب کیسے اُتر سکیں گے

☆ یہ غزلیں گزشتہ شمارے میں سہواً کسی اور صاحب کے نام سے چھپ گئی تھیں۔ ادارہ صاحبِ غزل محمود عامر سے معذرت خواہ ہے۔

غزلیں

شوکت فہمی

یوں تو ہر چیز راستے پر ہے — اِک ذرا تو ہی فاصلے پر ہے
فیصلہ موسموں کی قسمت کا — تیری آنکھوں کے فیصلے پر ہے
مَیں قریب آ کے تجھ کو دیکھوں گا — مجھ سے تو کتنے فاصلے پر ہے
ہجر میں کس کو کتنا جینا ہے — اپنے اپنے یہ حوصلے پر ہے
اے خدا بھیج دے ابابیلیں — کوئی تنہا مقابلے پر ہے

فہمی اپنی یہ جہت منزل
قرض ایک ایک آبلے پر ہے

☆☆☆

یوں نہ مٹی سے اٹ گئے ہوتے — ہم جو رستے سے ہٹ گئے ہوتے
ہم تمہارے اگر نہ ہو پاتے — کتنے ہاتھوں میں بٹ گئے ہوتے
ایسے لشکر سی کتنا بہتر تھا — ہم اکیلے ہی ڈٹ گئے ہوتے
کاش جھونکے کتاب ہستی سے — ورق سارے اُلٹ گئے ہوتے
ہم نے سب کشتیاں جلا ڈالیں — ورنہ کب کے پلٹ گئے ہوتے

تم نے فہمی اماں نہ مانگی تھی
ورنہ یہ پیڑ کٹ گئے ہوتے

غزلیں

عرفان صادق

فلک نے اپنی کمر سے کمان باندھی ہے — کہ جب سے ہم نے پروں سے اُڑان باندھی ہے
وہی قبول کرے گا مری دُعاؤں کو — وہ جس نے سانس کی ڈوری سے جان باندھی ہے
یہ کون ہے مری سانسوں میں تھرتھراتا ہوا — یہ کس نے میرے بدن سے تھکان باندھی ہے
تجھے ہے زُعم کہ میں بولنے سے عاری ہوں — ترے لحاظ نے میری زبان باندھی ہے
یہ گر رہی ہیں جو آنکھوں سے آبشاریں سی — کسی نے جسم سے غم کی چٹان باندھی ہے

شکستہ ذات کو لفظوں سے جوڑ کر عرفانؔ
بڑے سلیقے سے یہ داستان باندھی ہے

☆☆☆

ذکر کربل کا نہیں ایسے فراوانی کے ساتھ — پیاس کا اِک سلسلہ بھی ہے جڑا پانی کے ساتھ
مَیں تری ضیافتوں پر تبصرہ کیسے کروں — سانس تک آتا نہیں جب میرا آسانی کے ساتھ
اوڑھ کر بیٹھا نہیں ایسے ہی سناٹوں کی گونج — خواب بھی کچھ دفن ہیں آنکھوں کی ویرانی کے ساتھ
اس لیے جاتا نہیں دریاؤں کی دہلیز پر — پیاس بڑھ جاتی ہے میری اور بھی پانی کے ساتھ

لمحۂ تخلیق کا عرفانؔ جب ہونے لگے
خود بخود بہتا ہوں میں لفظوں کی طغیانی کے ساتھ

غزلیں

محمد خالد

کس نے جانا ہے جو اسرار عجب خاک میں ہے
خاک کو جس نے بھی چھوڑا ہے وہ اب خاک میں ہے

اِک فقط میرے ہی دل میں نہیں چاہت اس کی
مجھے معلوم ہے میری بھی طلب خاک میں ہے

خطہء خواب میں تادیر نہیں رُک پائے
پلٹ آتے ہیں کہ تاثیر عجب خاک میں ہے

کچھ فنا کا ہی اجارہ نہیں تو بھی سُن لے
زندگی تیرا خزینہ بھی تو سب خاک میں ہے

کیسے کیسے ہیں طلسمات ہواؤں کے مگر
کیا کروں مَیں کہ مرا اسم ہی جب خاک میں ہے

☆☆☆

نہیں ایسا کہ خموشی کو گوارا ہی کیا
کوئی آئی نہ صدا، پر مَیں پکارا ہی کیا

اس خرابے میں رکھی ہیں نئی بنیادیں بھی
یہ نہیں ہے کہ فقط درد کا چارہ ہی کیا

کچھ نہ تھا دل کے تئیں کام، ادھر چشم نے بھی
دیر تک کیفیت ِ دل کا نظارہ ہی کیا

نظر آنے لگی بے رنگ سی تصویر حیات
ہم نے بھی کارِ محبت سے کنارہ ہی کیا

شرحِ احوال کی فرصت ہی سفر میں کب تھی
جانے والے نے نگاہوں سے اشارہ ہی کیا

یہ مسافت حد ِیک خواب سے آگے نہ گئی
ہم نے اس وادیٔ غربت میں گزارا ہی کیا

غزلیں

ابرار احمد

مَیں اپنی صبح رکھتا ہوں اور اپنی شام رکھتا ہوں
پھر اس بے ربط سے خاکے میں، خود سے کام رکھتا ہوں

سلیقے سے مَیں اس کی گفتگو کا لطف لیتا ہوں
اور اس کے رُوبرو، دل میں، خیالِ خام رکھتا ہوں

بظاہر مدح سے اس کی کبھی تھکتا نہیں، لیکن
درونِ خانۂ دل، خواہشِ دُشنام رکھتا ہوں

خوش آئی ہے ابھی تو، قیدِ خواہش، اس خرابے میں
ابھی خود کو رہینِ گردشِ ایام رکھتا ہوں

فراق و وصل سے ہٹ کر کوئی رشتہ ہمارا ہے
کہ اس کو چھوڑ پاتا ہوں نہ اس کو تھام رکھتا ہوں

سفر کی صبح میں رنجِ سفر کی دھول اُڑتی ہے
حدِ آغاز میں اندیشۂ انجام رکھتا ہوں

دلیلِ خوابِ مستی ہے، تری آمادگی امشب
مگر اس مشب میں تجھ سے، اور کوئی کام رکھتا ہوں

تجاوز سے بھلا کب تک گزر اوقات ممکن تھی
سو اپنے خون تک شورِ دلِ بدنام رکھتا ہوں

☆☆☆

زمیں نہیں یہ مری، آسماں نہیں میرا
متاعِ خواب سوا، کچھ یہاں نہیں میرا

یہ اُونٹ اور کسی کے ہیں، دشت میرا ہے
سوار میرے نہیں، سارباں نہیں میرا

مجھے تمہارے تیقن سے خوف آتا ہے
کہ اس یقین میں شامل، گماں نہیں میرا

مَیں ہو گیا ہوں خود اپنے سفر سے بیگانہ
کہ نیند میری ہے، خوابِ رواں نہیں میرا

تو آب و خاک سے بچ کر کدھر کو جاتا میں
دوامِ وصل ہے باقی، نشاں نہیں میرا

پھر ایک دن اُسی مٹی کو لوٹ جاؤں گا
گریز تجھ سے، رہِ رفتگاں! نہیں میرا

صدائے شہرِ گزشتہ ابھی بلاتی ہے
گو اب عزیز کوئی بھی وہاں نہیں میرا

غزلیں

ریحانہ قمر

مجھے وہ کیفیت اپنی بتانے کیوں نہیں آیا
تجھے معلوم تو ہو گا زمانے کیوں نہیں آیا

وہ سورج ہے تو پھر اُس کے نہ آنے کا سبب کیا ہے
مرے سائے سے ملنے کے بہانے کیوں نہیں آیا

مَیں اُس کو کھینچتی ہی رہ گئی لیکن نہ آیا وہ
وہ مرا سانس تھا اور سانس جانے کیوں نہیں آیا

دریچہ کھول کر کب سے سراپا گوش بیٹھی ہوں
کوئی موسم تری باتیں سنانے کیوں نہیں آیا

وہ کہتا تھا کہ اُس کی گفتگو ہے آئینے جیسی
تو پھر چہرہ مرا مجھ کو دکھانے کیوں نہیں آیا

☆☆☆

اذیتوں سے نکلنے کا مشورہ دیتی
میں اُس کی تھی تو نہیں پھر بھی حوصلہ دیتی

کسی عذاب سے کم تو نہیں ہے خوش رہنا
دُعا کے نام پر کیوں اُس کو بددُعا دیتی

چھپا بھی لیتی مرے بھید کو اگر بالفرض
ہَوا کا کیا ہے کوئی اور گل کھلا دیتی

خدا گواہ کہ سَر سے جھٹک کے دیکھ لیا
نہیں تھا بس میں وگرنہ اُسے بھلا دیتی

مَیں اُس کی خاص عنایت سے بچ گئی ہوں قمر
وگرنہ خلقِ خدا تو مجھے مٹا دیتی

غزلیں

اسدرضوی

پریم کے ہر جذبے سے عاری لگتی ہے — وہ لڑکی جو راج کماری لگتی ہے
مَیں نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھا ہے — مجھ کو وہ تصویر تمہاری لگتی ہے
اُس کے بنگلے کے اطراف میں پہرے ہیں — اُس کو ملنے میں دشواری لگتی ہے
دل کے بدلے میں وہ جان کی طالب ہے — پیار میں بھی وہ کاروباری لگتی ہے
داوَ پہ اُلفت میں وہ جان لگا ڈالے — وہ ہم سے بھی سخت جواری لگتی ہے
پوچھ ہی بیٹھی ہے دنیا تو بتلا دیں — رشتے میں وہ جان ہماری لگتی ہے
ملنے میں تاخیر اسدؔ جب ہو جائے
وہ غصے میں وہ اور بھی پیاری لگتی ہے

☆☆☆

نقش سورج میں جواں سال تمہارے دیکھوں — پھول کلیوں میں خدوخال تمہارے دیکھوں
آنکھ میں جیسے اُتر آئے مرے، سرخ گلاب — جب دہکتے ہوئے وہ گال تمہارے دیکھوں
دن پہ دیکھوں میں ترے چاند سے چہرے کا نکھار — رات پر چھائے ہوئے بال تمہارے دیکھوں
دل گرفتہ ہوا مَیں ہجر میں جاناں جیسے — کاش ایسے نہ کبھی حال تمہارے دیکھوں
وقت ملتا ہے ملاقات کا کچھ روز اسدؔ
راستے پھر میں کئی سال تمہارے دیکھو

غزل

ارشاد جالندھری

فکرِ سخن کے باب میں ہم نے کمال کر دیا
صنفِ غزل کو دہر میں فن کی مثال کر دیا

اُس کی نگاہِ جانفزا جسم کے پار ہو گئی
مَیں نے بھی اُس کی آنکھ کو چشمِ غزال کر دیا

اُس نے بھی میری سوچ میں حسن کے رنگ بھر دیئے
مَیں نے بھی اُس کو سوچ کر حسنِ خیال کر دیا

اُس نے بھی میری آنکھ کو ذوقِ نظر عطا کیا
مَیں نے بھی اُس کو دیکھ کر ماہ جمال کر دیا

ہاتھ کی اِک لکیر میں وصل کا پل بھی تھا، مگر
وقت کی چال نے اُسے ہجر کا سال کر دیا

جس کے لیے سمیٹ لیں مَیں نے تمام رفعتیں
اُس نے مرے عروج کو روبہ زوال کر دیا

شہر میں آ گئے ہیں ہم اُس نے سنی جو یہ خبر
رسمِ ستم کا سلسلہ پھر سے بحال کر دیا

☆☆☆

غزل

محمد رفیق سیٹھی

لمحے جو اس کے ساتھ گزارے تھے ایک بار
ہے ان کی یاد دل میں ابھی صورتِ بہار

تیرا نصیب چاند، ستارے، یہ کہکشاں
لیکن مرے لیے ہیں ترے درد کے شرار

جیسے گھٹا کی اوٹ میں ہو چودھویں کا چاند
زُلفوں میں ایسے رُخ کو چھپائے ہے بار بار

تیرے ہی دم سے زندگی تھی اور تیرے بعد
اس دل سے اُٹھ رہے ہیں بڑے درد کے غبار

آنے سے اس کے گھر جو مہکنے لگا رفیق
پت جھڑ بھی لگ رہی ہے ہمیں صورتِ بہار

غزلیں

مظہر بخاری

قدیم شہر کی بستی میں پاؤں دھرتا ہوں
قدم قدم پہ مَیں سب کا خیال کرتا ہوں

فلک نژاد بھی میرا طواف کرتے ہیں
مَیں سطحِ ارضِ فلک پر جونہی اُترتا ہوں

مری زمین کی خوشبو بھی ساتھ جاتی ہے
نئے سیارے پہ جس وقت پاؤں دھرتا ہوں

یہ اہلِ جبہ و دستار کیوں گریزاں ہیں
فقیر راہ گزر سے سوال کرتا ہوں

بڑے بڑے جہاں بے حوصلہ دکھائی دیں
بہ فیض حسن اُسی راہ سے گزرتا ہوں

جو کام کرنے کا ہوتا ہے بھول جاتا ہوں
جو کام کرنا نہیں ہے ضرور کرتا ہوں

عجیب شکلیں مرا منہ چڑانے لگتی ہیں
مَیں اپنے آپ سے مظہؔر اگر مُکرتا ہوں

☆☆☆

اَنا کے دشت میں تنہا دکھائی دیتا ہے
وہ ایک شخص جو مجھ سا دکھائی دیتا ہے

فضائے کوفہ میں اب بھی یزیدی باہم ہیں
حسین اب بھی اکیلا دکھائی دیتا ہے

یقین کرتے نہیں ہو مگر یہی سچ ہے
مجھے زوال کا لمحہ دکھائی دیتا ہے

حصولِ رزق کی خاطر یہ دربدر انساں
رضا کے رستے سے بھٹکا دکھائی دیتا ہے

مَیں لڑ رہا ہوں لڑائی جو میری ہے ہی نہیں
مرا حریف یہ کہتا دکھائی دیتا ہے

مہر بلب ہیں ستم سے ترے ہراساں ہیں
ترا خیال سب اچھا دکھائی دیتا ہے

مَیں اُس جگہ ہوں جہاں پر کبھی کبھی مظہؔر
یہ اپنا آپ پرایا دکھائی دیتا ہے

غزلیں

رامش منہاس

ہجوم غم میں کوئی بانکپن اچھا نہیں لگتا
گلاب اچھے نہیں لگتے چمن اچھا نہیں لگتا

برہنہ سر جہاں شہزادیاں پھرتی ہوں گلیوں میں
وہاں بے نام لاشوں پر کفن اچھا نہیں لگتا

اگر اہلِ چمن اُن کے نشیمن ہی جلا ڈالیں
تو پھر زخمی پرندوں کو چمن اچھا نہیں لگتا

سلگتی دھوپ کے میلے میں ان بے جان جسموں پر
مجھے تو موم کا یہ پیرہن اچھا نہیں لگتا

نہ جانے کونسی مجبوریاں ہجرت کراتی ہیں
وگرنہ کون ہے جس کو وطن اچھا نہیں لگتا

بتوں سے بت شکن ہر دَور میں نفرت ہی کرتے ہیں
کسی بت کو بھی کوئی بت شکن اچھا نہیں لگتا

دِلوں کے آبگینے جس سے چکنا چور ہو جائیں
مجھے رامشؔ وہ اندازِ سخن اچھا نہیں لگتا

☆☆☆

پھول کھلنے سے گریزاں ہوں اگر شاخوں پر
تتلیاں رقص بھلا کیسے کریں کانٹوں پر

پیرہن یوں ہی اُترے رہے گر جسموں سے
کون پہنائے گا پھر اُجلے کفن لاشوں پر

آسماں سے تو اُترتا ہے مرا رزق مگر
لوٹ لیتا ہے کوئی شہر کے دروازوں پر

یہ سمندر نے رفاقت کا صلہ بخشا ہے
تشنگی خوب سجا دی ہے مرے ہونٹوں پر

دشتِ بے درد میں یوں نوحہ گری برپا تھی
کربلا روتی رہی بکھری ہوئی لاشوں پر

یوں بھی توفیق انا ہوتی ہے کچھ لوگوں کو
لاش اپنی ہی اُٹھا لیتے ہیں خود کاندھوں پر

غم چھپانے سے کہاں چھپتے ہیں رامشؔ منہاس
مرثیے دل کے لکھے ہوتے ہیں سب چہروں پر

غزل

فقیر شکورالرحمٰن

ہم اپنی ذات میں یہ بھی کمال رکھتے تھے
کٹے پروں میں اُڑانیں سنبھال رکھتے تھے

بھری سی آنکھ دل پُرملال رکھتے تھے
کہ دشت میں بھی یہ چشمے اُبال رکھتے تھے

فریب آتا نہیں ہم کو روز مرنے کا
تری خوشی کے لیے وقت ٹال رکھتے تھے

ہم اپنے عکس کو کرتے تلاش اب کیسے
دریدہ آنکھیں تھیں شیشوں میں بال رکھتے تھے

اب اپنے قتل کے الزام کس کو دیتے فقیرؔ
کہ آستینوں میں ہم سانپ پال رکھتے تھے

☆☆☆

غزل

شوکت کاٹھیا

تجھے سوچوں تو جینے کا ارادہ رقص کرتا ہے
کہ جیسے مست آنکھوں میں اشارہ رقص کرتا ہے

کوئی جب ڈال دیتا ہے گھڑا کچا جو لہروں میں
تو دریائے محبت کا کنارہ رقص کرتا ہے

ترے آنے سے جب بادِ صبا چلتی ہے گلشن میں
تو گلشن کے سبھی پھولوں کا حلقہ رقص کرتا ہے

مرے زردار تو نے بھی کبھی دیکھا ہے یہ منظر
کہ جب مزدور کے ہاتھوں میں لقمہ رقص کرتا ہے

دھمالیں ڈالنا مٹی پہ سچائی ہے پیڑوں کی
کہ جب شاخوں سے گرتا ہے تو پتا رقص کرتا ہے

مَیں لکھوں بھی تو کیا لکھوں ترے پیکر کے بارے میں
پری پیکر تجھے چھو کر لبادہ رقص کرتا ہے

کسی کو رُوبرو پا کر مرا نادان دِل شوکتؔ
جو آدھا مست ہوتا ہے تو آدھا رقص کرتا ہے

غزل

رضا عباس رضا

مٹھی میں بھی ریت بچائی جا سکتی ہے
تم چاہو تو بات بنائی جا سکتی ہے
تم چاہو تو سپنے سچے ہو سکتے ہیں
کانٹوں سے بھی خوشبو لائی جا سکتی ہے
تم چاہو تو خاموشی کے پہروں میں بھی
لفظوں کی جھانجھر پہنائی جا سکتی ہے
تم چاہو تو اِک سچی تصویر کے بدلے
اِک جھوٹی تصویر مٹائی جا سکتی ہے
تم چاہو تو آنکھیں صحرا کر سکتا ہوں
اور صحرا میں فصل اُگائی جا سکتی ہے
تم چاہو تو ٹیلیفون رسیور پر بھی
اپنی تازہ نظم سُنائی جا سکتی ہے
تم چاہو تو ایک رضا عباسؔ کی خاطر
ماضی کی ہر بات بھلائی جا سکتی ہے

☆☆☆

غزلیں

شبیر شاذلؔ

وہ اگر ہم کلام ہو جائے
عشق میں میرا نام ہو جائے
آپ اگر گیسوؤں کو لہرا دیں
شام سے پہلے شام ہو جائے
آدمی خوش نصیب ہے جس کی
زندگی تیرے نام ہو جائے
جس کو کہتے ہیں ہم وفا شاذلؔ
یہ چلن کاش عام ہو جائے

غزل

محمد رمضان

تازہ لہو سے تازہ کہانی لکھی گئی
مجھ سے کوئی غزل نہ پرانی لکھی گئی
دل کی تپش بھی اشک فشانی لکھی گئی
اندھیرا ہے کہ آگ بھی پانی لکھی گئی
طوفان کا فضول ' احاطہ کیا گیا
بے فائدہ کتاب جوانی لکھی گئی
استادیاں دکھا گئے قاتل کرائے کے
قاتل کے مشوروں سے کہانی لکھی گئی
رمضانؔ کے قلم کی عبارت تو دیکھئے
اندھی رُتوں میں دن کی کہانی لکھی گئی

☆☆☆

غزلیں

ش۔ا۔اعجاز

جب سیلِ غم میں لوگ بکھرتے چلے گئے
اپنے نصیب اور سنورتے چلے گئے
خود اپنے مسئلوں کا سبب آپ تھے مگر
الزام دوسروں پہ جو دھرتے چلے گئے
کچھ بات دل کی اُس نے اس انداز سے کہی
الفاظ دل کی تہہ میں اُترتے چلے گئے
اعجازؔ آ گئے وہ عیادت کو جب مری
زخموں کے پھول اور نکھرتے چلے گئے

غزلیں

شکیل سروشؔ

سن سکے سارا زمانہ داستاں ایسے سُنا — تجھ پہ جو بیتی ہے چھپوا دے کسی اخبار میں
حالِ دل لکھتے ہوئے جذبات کی رو میں نہ بہہ — اپنے اندر کی گھٹن شامل نہ کر اظہار میں
ذہن پر مت کر مسلط جمع اور تفریق کو — خوبصورت زندگی کو بیچ مت بازار میں
ٹوٹتے ہیں کتنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنے دل — یہ خبر چھپتی نہیں لیکن کسی اخبار میں

ہر کسی کو مت بتا مجبوریاں اپنی سروشؔ
اس طرح رُسوا نہ کر خود کو بھرے بازار میں

☆☆☆

ترا دامن بھی اشکوں سے بھگونا چاہیے تھا — مجھے تیرے گلے لگ کر یوں رونا چاہیے تھا
تجھے بھی چاہیے تھا یونہی مجھ کو خوار کرنا — مجھے بھی اس طرح ہی خوار ہونا چاہیے تھا
نہ جانے کس طرح زندہ ہوں ورنہ تیرے دُکھ میں — مجھے اے دوست اب تک خاک ہونا چاہیے تھا

مجھے بھی ٹوٹنے کے واسطے تیری ضرورت تھی
تجھے بھی میرے جیسا ہی کھلونا چاہیے تھا

☆☆☆